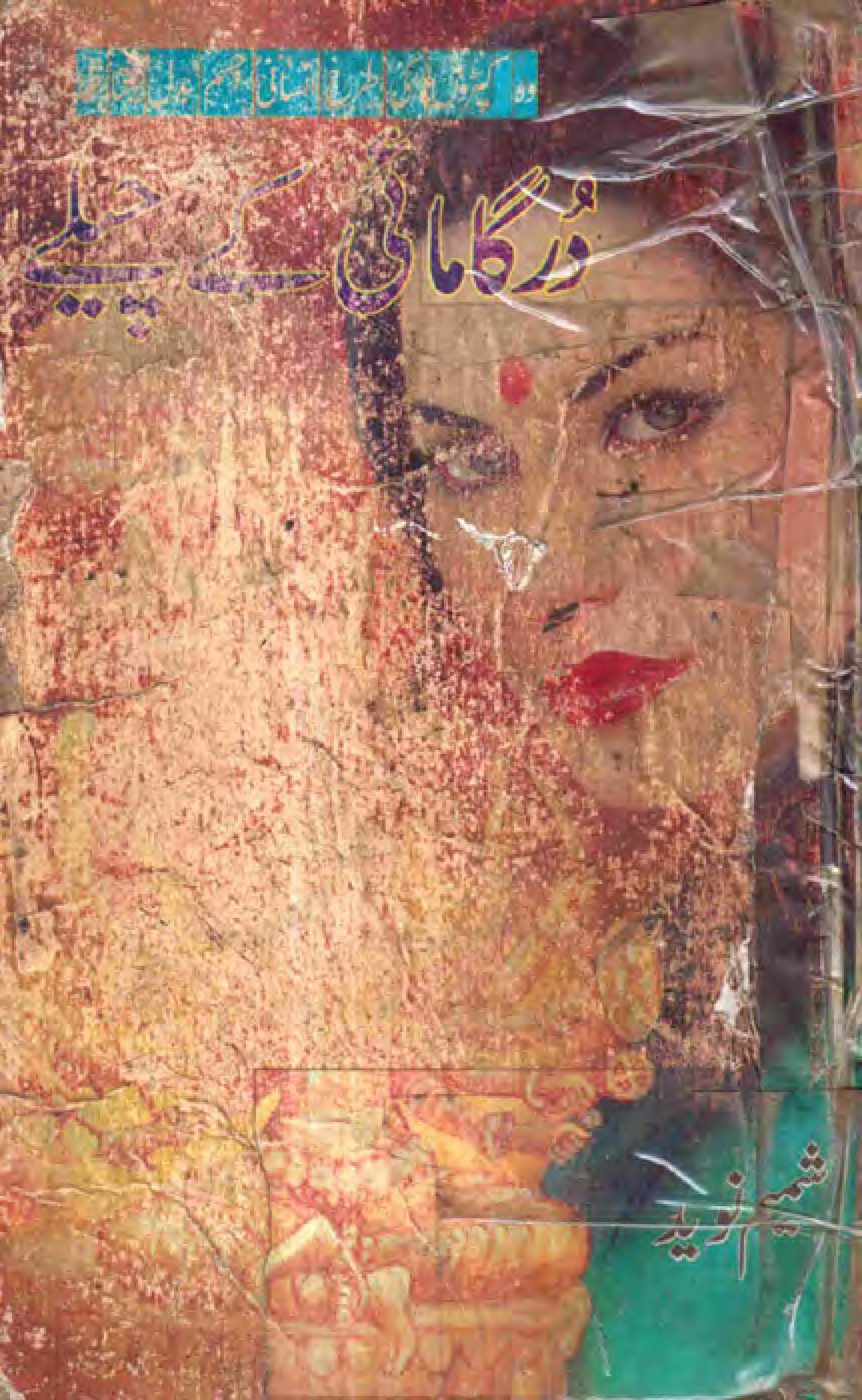

درگا مائی کے چیلے
شمیم نوید

تم خود دیکھ لو میرے اپنے جسم کا گوشت میرے سامنے گل گل کے بہہ رہا ہے۔ میرے مرنے کے انتظار میں چاروں طرف چمکیلی آنکھوں والے گدھ بیٹھے ہیں۔ یہاں دور تک صرف تم ہو اور گھنا اداس جنگل بالکل میری زندگی کی طرح..... نہیں! نہیں.... مجھے یہاں پڑا رہنے دو.... اسی پیڑ کے نیچے ... اب مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں رہی کہ دو چار قدم بھی چل سکوں۔ تم بھی کتنے رحم دل ہو کنور! تمہیں گاؤں والوں کی طرح مجھ کوڑھی سے گھن نہیں آتی' بلکہ روز میرے لئے کھانا لاتے ہو' میرے پاس بیٹھ کر میرا دل بہلاتے ہو اور وہ بھی بغیر کسی لالچ اور غرض کے۔ میں نے اکثر تمہاری آنکھوں میں ایک سوال پڑھا ہے۔ تم کتنے نیک دل ہو کہ آج تک یہ سوال اپنی زبان پر نہیں لائے کہ کہیں میں تمہیں لالچی نہ

سمجھوں میرے پاس تمہارے لئے کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ صرف کچھ بے اثر دعائیں ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم کہانیاں لکھتے ہو اور تمہارا ذریعہ معاش بھی یہی ہے۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں چھپا ہوا سوال پڑھ لیا ہے۔ تم جاننا چاہتے ہو' میں کون ہوں؟ مجھے یقین ہے کہ اب میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ اس لئے مرنے سے پہلے تمہیں اپنی آپ بیتی ضرور سناؤں گا۔ اور دیکھو! اسے جوں کا توں حرف بہ حرف لکھ دینا۔ شاید کوئی میری زندگی کے سچے واقعات پڑھ کر عبرت حاصل کر سکے۔ میری آخری خواہش بھی یہی ہے۔

شاید تم نہ جانتے ہو کہ میرا اصل نام مرلی دھر نہیں ہے علی حسن ہے اور تم جو یہ جسم دیکھ رہے ہو' یہ بھی میرا اپنا جسم نہیں ہے۔ حیرت سے مجھے مت دیکھو! میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ تم میری زندگی کے واقعات سنو گے تو خود تمہیں پتہ چل جائے گا' میرا اپنا جسم بہت خوبصورت تھا بہت...... تم یہ جسم دیکھ کر اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ میرا اصل جسم کیسا ہوگا.... خیر تو اب سنو کہ میں قصبہ دھرم پور کا رہنے والا ہوں۔ میرے آباء و اجداد ہندو تھے۔ میرے دادا پیارے لال شرما نے پیر چونڈیرے شریف کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ میرے دادا کا نام پیر چونڈیرے شریف نے شریف علی رکھا تھا۔ شریف علی کے والد یعنی میرے پردادا کٹر قسم کے ہندو تھے۔ ان کا نام پنڈت گنگا پرشاد شرما تھا' قصبے بھر میں ہمارا خاندان عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ میں نے بچپن سے اب تک اپنے دادا گنگا پرشاد کے بارے میں بہت سی عجیب باتیں سنی تھیں جو اس وقت مجھے کبھی بڑی بچکانہ اور کبھی کبھی بڑی

پراسرار محسوس ہوتی تھیں لیکن اب اُن سب باتوں پر مجھے پورا یقین آچکا ہے۔

پنڈت گنگا پرشاد نے مرنے سے پہلے ایک پیشگوئی کی تھی وہ یہ کہ میرے دادا شریف علی کا صرف ایک پوتا ہوگا.... جو مذہب اسلام سے پھر جائے گا اور دوبارہ ہندو دھرم کا پالن کرے گا اور یہ بھی کہ اس کے بعد نسل آگے نہیں بڑھے گی۔ یہ عجیب و غریب پیش گوئی میرے بارے میں تھی۔ ایک حد تک یہ پیش گوئی میرے ہوش سنبھالنے تک پوری ہو چکی تھی یعنی میرے کوئی بھائی بہن نہیں ہو سکا۔ میرے والد شتاب علی نے بہت تعویز گنڈے کرائے مگر ان کے اور کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

میرے دادا شریف علی اپنے والد پنڈت گنگا پرشاد ہی کی زندگی میں پیر چونڈیرے شریف کے ہاتھ بعیت کر کے مسلمان ہو چکے تھے جس کے سب پنڈت گنگا پرشاد ان سے بہت ناراض تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی زمینیں اور مکانات بجائے میرے والد کے نام کرنے کے ہنومان جی کے نام کر دیئے اور میرے دادا کو گھر سے نکال دیا۔

پنڈت گنگا پرشاد نے جو پیش گوئی میرے بارے میں کی تھی اس میں یہ بھی شامل تھا کہ جو وہ منتر وہ اپنی زندگی میں پورا نہیں کر سکے۔ وہ میں پورا کروں گا اور اس میں کامیاب بھی رہوں گا' یہ منتر درگا رمائی کا منتر کہلاتا ہے۔ اس منتر کا جاپ کرنے والے درگامائی کے چیلے کہلاتے ہیں۔ منتر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا جاپ پورا کرنے والا جب چاہے اپنی جون بدل سکتا ہے' اپنا جسم چھوڑ کر کسی بھی جسم پر قبضہ کر سکتا ہے۔ یہ سب باتیں میرے والد شتاب علی نے اپنے والد یعنی

میرے دادا شریف علی سے سنی تھیں اور ان کی زبانی یہ مجھ تک پہنچی تھیں یہی وجہ تھی کہ میرے والد شتاب علی نے میری تربیت ٹھیٹ مذہبی انداز میں کی۔

بچپن ہی سے میرے اوپر سخت پابندیاں عائد کردی گئیں پانچوں وقت کی نماز زبردستی بچپن ہی سے مجھے پڑھائی گئی تاکہ بڑا ہو کر نماز میری عادت بن جائے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی میری عمر 5 سال ہی کی ہوگی کہ مجھے پہلا روزہ رکھوادیا گیا اور اس دن کے بعد تمام روزے مجھ پر فرض کر دیئے گئے' مجھے یہ ایک طرح کی رسم سی لگی' تمام قصبے میں مٹھائی اور افطار کا سامان تقسیم کیا گیا۔ اس سب کا مقصد میرے والد شتاب علی کی نظر میں یہ تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ اسلامی تعلیمات سے قریب رہوں اور ہندو تہذیب میرے اوپر اثر انداز نہ ہو سکے' اس لئے مجھے کسی ہندو دوست سے ملنے یا اس کے ساتھ کھیلنے تک کی اجازت نہ تھی' بلکہ جب محلے کے تمام لڑکے کھیل رہے ہوتے تھے۔ میں ملا جی سے بیٹھا قرآن شریف پڑھتا تھا' میرے گھر سے نکلنے پر بھی پابندی تھی تاکہ میں کہیں کسی ہندو لڑکے یا آدمی سے بات تک نہ کرسکوں۔ اتنے پہرے میرے اوپر لگائے گئے تھے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ میں درگامائی کا منتر کہیں سے سیکھتا اور اس کا جاپ کرتا اور پھر مجھے اس کی ضرورت بھی کیا تھی' جب میں اس کی اہمیت اور خصوصیت ہی سے پوری طرح واقف نہیں تھا۔ لیکن میرے والد کی اس درجہ سختی کی وجوہ بہت سی تھیں۔ انہوں نے میرے والد سے پنڈت گنگا پرشاد کے جو واقعات سنے تھے وہ ایسے ہی تھے۔ گنگا پرشاد نے اپنی زندگی میں جو بھی پیش گوئی کی وہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوئی' وہ

بڑی پراسرار قوتوں کے مالک تھے۔ ان کی تمام زندگی منتروں کا جاپ کرتے گزری
تھی۔ اور انہوں نے کبھی کسی سے ہار نہیں مانی تھی۔ سوائے اپنے مرنے سے کچھ دن
پہلے کے' پنڈت گنگا پرشاد کا یہ واقعہ میں نے اپنے والد کی زبانی سنا تھا۔ یہ واقعہ اتنا
عجیب وغریب تھا کہ آج تک میرے ذہن پر نقش ہے۔

واقعہ اس طرح ہے کہ ایک مرتبہ پنڈت گنگا پرشاد کا ایک مولوی سے
زمینوں کے بارے میں جھگڑا ہو گیا۔ پہلے تو پنڈت گنگا پرشاد نے مولوی صاحب کو
بہت سمجھایا کہ ''دیکھو معاملہ سیدھی طرح طے کرلو''۔ معاملہ یہ تھا کہ پنڈت گنگا پرشاد'
مولوی فضل داد کی زمین پر جوان کی زمین ہی کے قریب تھی ناجائز قبضہ کرنا چاہتے
تھے۔ جس کے لئے مولوی فضل داد قطعی تیار نہیں تھے اور انہوں نے صاف صاف
کہہ دیا تھا کہ ''وہ اور ہوں گے جنھوں نے تمہارے منتروں وتتروں کی دھونس میں آ
کر اپنی زمینیں تمہیں سونپ دی ہوں گی۔ مگر میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ تم
سے جو کیا جائے کرلو''۔ زیادتی کچھ مولوی صاحب کی بھی تھی جو ایک دم گرم ہو گئے'
اس لئے کہ آج تک قصبے میں کسی کی اتنی مجال نہیں ہوئی تھی کہ پنڈت گنگا پرشاد کے
آگے اونچی آواز سے بھی بول سکتا اور اگر مولوی صاحب لجاجت سے کام لیتے تو
شاید پنڈت جی انہیں معاف کر دیتے جیسی کہ انکی عادت تھی کہ اگر کوئی ان کے
آگے رحم کی بھیک مانگتا یا فریاد کرتا تو وہ اسے نہیں ستاتے تھے۔ ایسے بھی کئی واقعات
قصبے میں ہو چکے تھے۔ ہر چند کہ اس تمام واقعے میں سارا قصور پنڈت جی ہی کا تھا
کہ وہ کیوں مولوی صاحب کی زمین ہڑپ کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہاں تو وہ مثل تھی

کہ زبردست مارے اور رونے نہ دے…… اس لیے مناسب یہی تھا کہ مولوی
صاحب درگزر سے کام لیتے اور پنڈت گنگا پرشاد کے قہر سے بچ جاتے مگر اس کے
برخلاف انہوں نے بقول پنڈت جی نہ صرف ان کی بے عزتی کی بلکہ انہیں چیلنج بھی
کر دیا۔ پھر کیا تھا پنڈت گنگا پرشاد غصے میں لال پیلے ہو گئے اور اسی غصے میں کہا۔

''جا مولوی! آج رات تیرے اوپر بھاری ہے۔''

مولوی صاحب نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''میں بھی پیر جونڈیرے شریف کا مرید ہوں' اگر آج ہی رات تجھے جاڑا
دے کر بخار نہ آ جائے اور تو بیری کی ڈال کی طرح تھر تھر کانپنے نہ لگے تو میرا نام
مولوی فضل داد نہیں۔'' یہ سن کر پنڈت گنگا پرشاد نے کچھ لمحے توقف کیا اور پھر کہا۔

''اچھا تو پھر آج کی رات تیری اور کل کی رات میری…… منظور؟''

مولوی صاحب نے کہا۔ ''منظور!'' یہ بھی تو نے مجھے کوئی اور سمجھا ہے۔''

پاس پڑوس کے لوگوں نے لاکھ سمجھایا مگر مولوی صاحب نے ایک نہ سنی
اور کہا۔ ''اس شیطان کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں' اسے سزا دینا ضروری ہے۔''

یہ سن کر پنڈت جی ایک دم غصے سے چلائے۔

''دیکھ مولوی! زبان سنبھال کر میں نے تجھے کل تک کی مہلت دی ہے۔
مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ تو میرے منہ آنے لگے۔ کل تک جو تجھ سے کیا جائے کر
لے پھر میری باری ہے۔''

اتنی بات سن کر اور لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر مولوی صاحب اپنے گھر

کی طرف روانہ ہوگئے اور پنڈت جی اپنی گڑھی کی طرف۔ مولوی صاحب کا گھر نزدیک ہی تھا مگر پنڈت جی ذرا دور رہتے تھے۔ ابھی پنڈت جی نے اپنے گھر کا آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ انہیں بڑے زور کی جھرجھری آئی اور زوروں کا جاڑا لگنے لگا حالانکہ یہ دن سخت گرمی کے تھے' انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی دونوں بغلوں میں دبا لئے اور دانت پر دانت جما کر تیز تیز قدموں سے راستہ طے کرنے لگے۔

گڑھی کے پھاٹک تک پہنچتے پہنچتے انکی حالت غیر ہوگئی یوں بھی کوئی ساٹھ سال سے اوپر تھے۔ پنڈت جی کو اتنے زور کا جاڑا چڑھا کہ ان کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور دانت بجنے لگے جیسے تیسے وہ گڑھی میں داخل ہوئے۔ اتنی بڑی گڑھی میں وہ تن تنہا رہتے تھے اس لیے کہ میرے دادا شریف علی کو تو انہوں نے مع بیوی بچوں کے گڑھی سے نکال ہی دیا تھا۔ گرتے پڑتے انہوں نے پھاٹک بند کیا اور بغیچے میں ہوتے ہوئے بس بیٹھک ہی تک آئے ہونگے کہ ان کے لئے مزید اپنے پیروں پر چلنا دوبھر ہوگیا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ مولوی فضل داد نے اپنا کام کر دیا' ان کی خوش قسمتی تھی کہ بیٹھک میں انہیں پلنگ بچھا مل گیا جس پر اتفاق سے بستر بھی پڑا تھا مگر کیونکہ گرمیوں کے دن تھے اس لئے بستر پر لحاف یا کمبل ہونے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ صرف ایک چادر رکھی تھی انہوں نے وہی چادر اوڑھ لی جب اس سے بھی سردی نہ گئی تو نیچے کی دری نکال کر اسے چادر کے ساتھ ملا کر بدن پر لپیٹ لیا اور گڑ مڑی ہو کر پڑ رہے۔ ان کی اس وقت عجیب حالت تھی کہ وہ جو منتر بھی اتار کے لئے یاد

کرتے تھے اسے بیچ میں ہی بھول جاتے تھے۔ جھنجلا کر دوسرے منتر کا جاپ شروع کرتے تھے پھر بیچ میں بھول جاتے تھے۔ اس طرح پنڈت جی ساری رات جاڑے بخار میں پھنکتے رہے۔ صبح ہوئی تو ان کی حالت کچھ سنبھلنے لگی۔

مولوی فضل داد اس وقت مسجد میں فجر کی اذان دے رہے تھے پنڈت جی بستر سے اٹھے تو انہیں ایسا لگا کہ جیسے ان کی عمر یک بیک ساٹھ سال سے بڑھ کر سو سال ہوگئی ہے انہوں نے اب جو ایک منتر یاد کیا تو فوراً یاد آ گیا طبعیت کی بحالی کے لئے وہ اسی منتر کا جاپ کرنے لگے منتر کے جاپ کے ساتھ ساتھ انہیں ایسا لگا کہ جیسے ان میں پھر توانائی واپس آنے لگی ہو۔ وہ دیر تک منتر کا جاپ کرتے رہے اور یہاں تک کہ وہ بالکل اعتدال پر آ گئے۔ لیکن تھوڑی نقاہت اب بھی باقی تھی' پھر یہ کہ رات بھر کے جاگے ہوئے بھی تھے' منہ ہاتھ دھو تھوڑا ناشتا پانی کر' لمبی تان سو گئے۔

پنڈت جی کی آنکھ مغرب کی اذان سے کھلی۔ اب وہ بالکل چاق و چوبند تھے۔ بستر سے اٹھے' نہائے اور گڑھی سے نکلے .... کچھ دور مسجد تھی۔ جس سے اکا دکا نمازی اب بھی نماز پڑھ کر نکل رہے تھے۔ ایک دم ان کی نظر مولوی فضل داد پر پڑی' مولوی صاحب نے نظر ملتے ہی پہلے تو پنڈت جی کچھ جھجکے۔ مگر پھر ایک دم غصے سے لال ہوگئے۔ مولوی صاحب کی مسکراہٹ اس وقت جلتی پر تیل کا کام کر گئی' اس معنی خیز مسکراہٹ سے انہیں اپنی بڑی تضحیک محسوس ہوئی۔

پنڈت جی چیخ کر بولے۔ ''بس مولوی! یہی سیکھا ہے تو نے..... ہونہہ!

..... ایسے جنتر منتر تو میری جیب میں پڑے رہے ہیں''۔

مولوی فضل داد نے کہا۔''پھر بچ گیا ہوتا میرے وار سے..... کھا اپنے بھگوان کی قسم کہ تجھے رات جاڑا بخار نہیں آیا''

پنڈت گنگا پرشاد بولے''میں جھوٹ نہیں بولوں گا' جاڑا بخار تو آیا تھا پر آج رات میری ہے' تو قول دے چکا ہے مولوی''

مولوی صاحب نے کہا۔''ہاں! قسم ہے مجھے خدا کی جو آج کی رات میں تیرے اوپر کوئی وار کر جاؤں' مسلمان کی زبان ایک ہوتی ہے' مر جاؤں گا پر اپنی زبان سے نہیں پھروں گا پنڈت! کیا سمجھتا ہے تو مجھے..... جو ہو سکے کر لینا''۔

مولوی فضل داد اور پنڈت گنگا پرشاد کی تو تو میں میں سن کر سب لوگ جمع ہو گئے۔خدا خدا کر کے دونوں کو الگ کیا.... مولوی صاحب اپنے گھر اور پنڈت جی دوبارہ اپنی گڑھی واپس چلے گئے۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی پتا چلا کہ مولوی فضل داد کی طبعیت بے حد خراب ہے اور وہ منہ کے راستے خون ڈال رہے۔ ہیں تمام قصبے کے لوگ مولوی صاحب اور پنڈت جی کی جنگ سے واقف تھے۔وہ سب جمع ہو کر پنڈت جی کی گڑھی میں ان سے ملنے پہنچے۔وہاں جا کر دیکھا تو پنڈت جی اپنے باغ کے کچے کنوئیں کے پاس صرف ایک دھوتی پہنے بیٹھے تھے' انکے چاروں طرف ایک حصار سا کھنچا ہوا تھا۔کان میں جینو پڑا ہوا تھا اور وہ کسی منتر کا جاپ کر رہے تھے' تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ایک کنکری اٹھاتے اور اس پر کچھ پڑھ کر پھونکتے اور زور سے

ایک بار''جے درگامائی'' کہہ کر کنکری کچے کنوئیں میں پھینک دیتے کنوئیں سے بڑے زور کی آواز آتی جیسے کسی نے کوئی بہت بڑا پتھر پانی میں پھینک دیا ہو۔کنوئیں میں کنکری کے گرتے ہی بہت تیزی سے دھواں اٹھتا اور جب وہ دھواں صاف ہو جاتا تو پنڈت جی دوسری کنکری اٹھاتے اور اس پر منتر پڑھ کر پھونکنے لگتے۔تمام قصبے والوں نے یہ منظر دیکھا۔ان آنے والوں میں مولوی صاحب کی بیوی' ان کا لڑکا اور بیٹی بھی تھے جو مولوی صاحب کی طرف سے معافی مانگنے آئے تھے۔تمام قصبے والے کھنچے ہوئے حصار کے باہر ہی کھڑے رہے اور جب انہوں نے دیکھا کہ پنڈت جی ایک اور کنکری زور سے جے درگامائی کہہ کر کنوئیں میں پھینک چکے اور کنوئیں سے دھماکے کے ساتھ دھواں اٹھا چکا تو وہ زور زور سے چلاّ چلاّ کر اور پنڈت جی سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافی مانگنے لگے۔پنڈت جی جو شاید اب تک ان لوگوں کی موجودگی سے ناواقف تھے اور آنکھیں میچے منتر کا جاپ کر رہے تھے ایک دم شور سن کر چونک پڑے اور آنکھیں کھول دیں اس وقت ان کی آنکھیں کھول دیں اس وقت ان کی آنکھیں دیکھ کر تمام لوگ ڈر گئے لال لال بھیانک آنکھیں۔تمام قصبے و لے ان سے مولوی صاحب پر رحم کرنے کی درخواست کرنے لگے اور مولوی صاحب کی طرف سے خو معافی مانگنے لگے اور کہنے لگے۔

''پنڈت جی' آپ مولوی صاحب کی ساری زمین بھی لے لیں اور ہم مین سے جس کی زمین پر قبضہ چاہیں کر لیں' مگر مولوی صاحب کی جان بخش دیں''۔

مولوی صاحب کی بوڑھی ماں بھی اپنے پوپلے منہ سے پنڈت جی سے

فریاد کرنے لگیں اور اپنے بچے کی زندگی کی بھیک مانگنے لگیں۔ مگر پنڈت جی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اور برابر کچے کنویں میں کنکریاں پھینکتے رہے اور لوگوں کے دل ہر کنکری کے ساتھ دہلتے رہے۔ وہ برابر چیختے رہے۔

''اب بس کیجئے پنڈت جی! بس کیجئے.... معاف کر دیجئے آپ کو خدا کا واسطہ..... بھگوان کے لئے چھما کر دیجئے مہاراج۔'' اس مجمع میں ہندو مسلم بھی تھے۔ جب شور زیادہ بڑھنے لگا تو پنڈت گنگا پرشاد ایک دم آنکھیں کھول کر مجمع پر گرجے۔

''چلے جاؤ! احمقو چلے جاؤ...... بہت برا سمے ہے...... اگر میں اس سمے (وقت) اپنے منتر کا جاپ چھوڑ دوں گا تو جو حالت اس وقت مولوی کی ہوئی ہے میری ہو جائے گی اور میں تمہارے سامنے منہ سے خون ڈال ڈال کر مر جاؤں گا چلے جاؤ۔ ورنہ سب کو بھسم کر دوں گا''۔

پنڈت جی کی کڑک دار آواز لوگوں پر بجلی بن کر گری اور وہ ڈر کے مارے ایک ایک کر کے کھسکنے لگے اور جاتے جاتے ان کے کانوں میں جے درگامائی کے نعرے گونجتے رہے' پے در پے زبردست دھماکے ہوتے رہے جس سے تمام بستی لرزتی رہی۔ قصبے کے لوگ جب واپس مولوی صاحب کے مکان میں داخل ہوئے تو وہ آخری ہچکیاں لے رہے تھے۔ ان کا بستر خون سے تر بہ تر تھا۔ یہ بڑا بھیانک منظر تھا' مگر کوئی کیا کر سکتا تھا سوائے خدایا بھگوان کو یاد کرنے کے۔ اس لئے کہ پنڈت جی کا رعب ان کے دلوں پر اس واقعے کی وجہ سے اتنا بیٹھ گیا تھا کہ وہ دل

تک میں پنڈت جی کو برا سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ کہیں اس سے انہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

آخر کار مولوی صاحب ایک ودفعہ زور سے تڑپے اور ٹھنڈے ہو گئے۔ اس وقت لوگوں نے آخری دھماکا سنا اس کے بعد دھماکے آنے بند ہو گئے۔ شاید پنڈت جی جان چکے تھے کہ ان کا شکار دم توڑ چکا ہے۔ جبھی لوگوں کو اب جے دُرگامائی کے نعرے اور دھماکوں کی آوازیں نہیں سنائی دے رہی تھیں۔ مولوی صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بھائی کریم داد نے کہا کہ کم از کم ان کے پیر صاحب کو تو ان کے مرنے کی اطلاع دے ہی دینی چاہئے

کریم زادا ابھی یہی کہہ پائے تھے کہ دیکھا دروازے سے ایک سفید ریش بزرگ داخل ہو رہے ہیں......اور یہ پیر جونڈیرے شریف تھے۔

جیسے ہی پیر صاحب چونڈیرے شریف نے اس کمرے میں قدم رنجہ فرمایا جس میں مولوی فضل داد کا جنازہ رکھا تھا تمام حاضرین سکتے کے عالم میں رہ گئے اس لئے کہ ابھی کچھ لمحے پہلے ہی تو مولوی فضل داد مرحوم کے چھوٹے بھائی کریم داد نے ان کا نام ناہی لیا تھا' ادھر نام لیا ادھر موجود۔ دوسری عجیب وغریب بات جو شاید بہت کم لوگوں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ پیر صاحب کے تشریف لاتے ہی اچانک مولوی فضل داد کا جسم یکبار بہت زور سے کانپا جس سے انکی تمام چارپائی یکبار زور سے چرچرائی اور ایک دم مولوی فضل داد کا جسم تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔ لوگ پیر صاحب کی زیارت میں اتنے منہمک تھے کہ انہیں یہ واقعہ خواب سے لگا۔ لیکن مولوی

فضل داد مرحوم کی لڑکی زرینہ جو مرحوم کی چارپائی کے بالکل قریب تھی اچانک اس تبدیلی سے چیخ مار کر اپنی ماں کریمن سے لپٹ گئی۔ یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا۔

زرینہ کی چیخ نے جیسے تمام لوگوں کو پھر سے خواب کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں دھکیل دیا۔ وہ چیخ سن کر چونکے اور پھر پیر صاحب کے ادب سے دو طرفہ کھڑے ہو گئے تاکہ پیر صاحب جنازے تک پہنچ سکیں...... پیر صاحب آگے بڑھے لوگوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ تیرتے ہوئے چل رہے ہوں۔ پیر صاحب کی چال ایسی ہی تھی۔ انہوں نے زرینہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔ ''بیٹی! ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی' ورنہ تمہارے سر سے تمہارے شفیق باپ کا سایہ نہ اٹھتا...... صبر کرو' اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے'' اس آواز میں عجیب سا سحر تھا۔ زرینہ ہچکیاں لیتے لیتے خاموش ہو گئی اور کھوئی کھوئی نظروں سے کبھی پیر صاحب اور کبھی اپنے باپ کے جنازے کو دیکھنے لگی۔ پیر صاحب کی آواز پھر گونجی۔

''مرضی خدا میں دخل دینا فقیروں کا شیوہ نہیں ہم پر اللہ کے کرم سے تمام حالات منکشف ہو گئے تھے۔ مگر ہم نے دخل اندازی نہیں کی اس لئے کہ فضل داد مرحوم پنڈت گنگا پرشاد سے عہد کر چکے تھے کہ وہ اس کے خلاف کچھ نہیں کریں گے لیکن جب ہم نے دیکھا کہ پنڈت تو ہمارے مرید کو ختم کرنے ہی کے درپے ہے تو ہم اپنی خانقاہ سے چل دیئے، مگر مرضی مولا کہ ہمیں راہ میں دیر ہو گئی، اس کا سبب یہ ہے کہ ہمیں راستے میں شاہِ جنات حضرت سلیمان کا پیغام ملا کہ فوراً کوہِ قاف پہنچیں اور سندِ فارغ العمل وصول کریں یہ پیغام ہمارے لئے حکم کا درجہ رکھتا تھا، اسی لیے

ہم نے پہلے اسے ترجیح دی، اس سند کی رو سے ہمیں کسی عمل کے لیے چلہ کشی کرنے کی ضرورت نہیں رہی اب ہم کلی طور پر اپنی مرضی کے مختار ہیں۔ ہم اس سند کے فیض سے اب ہر عمل کے عالم ہیں۔ یہ سند سینکڑوں برسوں میں کسی کو کبھی کبھار ملتی ہے۔ ہم شاہِ جنات حضرت سلیمان کے دربار میں حاضر ہو کر آداب بجا لائے، وہاں کی شان و شوکت بیان سے باہر ہے۔ ہمیں اپنے دستِ خاص سے حضرت شاہ سلیمان نے خلعتِ فاخرہ عطا فرمائی اور ہمیں اپنے سینے سے لگا کر بھینچا۔ ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ ایک روشنی سی شاہِ جنات کے سینہ مبارک سے نکلی اور ہمارے وجود میں داخل ہو گئی شاہِ جنات نے فرمایا۔

''اب تم جو قصد کرو گے اللہ کے حکم سے پورا ہو گا۔'' پھر ذرا توقف کے بعد فرمایا۔ ''اب تم مجلس اجنہ و اولیا کی صدارت بھی کرو گے اور دنیا کے بارے میں فیصلے کرو گے اور باہم مشورت کے بعد کسی بھی ملک و قوم کے بارے میں حکم صادر کرو گے وہاں اپنے قطب و ابدال مقرر کرو گے، تاکہ نظامِ دنیا بہتر دنیا طور پر چلتا رہے تمہارے سامنے جو حضرات اس وقت موجود ہیں، یہ تمام دنیا کے قطب، قلندر اور ابدال ہیں، ساری دنیا پر انہیں کی حکمرانی ہے۔ آج یہ لوگ اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ اول تو تمھاری رسم فارغ العمل میں شریک ہو سکیں، دوم یہ کہ مغرب کے ایک بڑے ملک کی بادشاہت کا مسئلہ درپیش ہے، یہاں اس ملک کے قطب بھی موجود ہیں جو حقیقت میں وہاں کے حکمراں ہیں۔ مگر دنیائے ظاہر پرست نے اپنا جو بادشاہ منتخب کیا تھا وہ عوام کے لئے سوہان روح بنا ہوا ہے اس لئے بادشاہ اصلی یعنی قطب

وقت اس ملک سے اسے معزول کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں انہیں تمام حاضرین کی اجازت درکار ہے۔تمام معاملہ سن کر آخری فیصلہ اس پر تم دو گے کہ آیا بادشاہِ ظاہر کو معزول کیا جانا چاہیے یا نہیں، یا اسے عارضی طور پر کوئی سزا دے کر آئندہ کے لئے محتاط کر دینا چاہیے تاکہ آئندہ وہ عوام پر ظلم وستم نہ کرے اور اسکے دل میں خوف الٰہی پیدا ہو۔''

اتنا کہہ کر شاہِ جنات نے ہمیں حکم دیا کہ ہم ان کے ساتھ تخت پر بیٹھیں۔ تخت جس کو اجنہ اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔شاہِ جنات نے ہمارا ہاتھ پکڑا اور ہمیں اپنے برابر بیٹھنے کا شرف عطا فرمایا۔شاہ جنات نے ایک بزرگ صورت شخص کو اشارہ کیا کہ وہ مغرب کے اس ملکِ خاص کے بادشاہِ ظاہر پر جو فردِ جرم عائد ہوتی ہے سب کو پڑھ کر سنائیں، وہ بزرگ اپنی نشست سے اٹھے اور فرمایا:

بادشاہِ ظاہر پر تین مرتبہ حجت تمام کی جا چکی ہے۔پہلی مرتبہ سزا کے طور پر ہم نے اس کا جوان بیٹا اس سے چھین لیا مگر اس پر اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اس طرح کچھ دن اپنے بیٹے کو رو پیٹ کر پھر عیش وعشرت میں مگن ہو گیا۔دوسری بار ہم نے اس کی چہیتی بیوی اس جدا کر کے اس کے ایک غلام کے ساتھ فرار کرا دی تاکہ اس کی عزت پر ضرب لگے تو شاید توبہ کر لے اس کا غلام ملکہ کو فرار کرا کے اس کے ہمسایہ دشمن ملک میں پناہ گزیں ہو گیا، اس سے بھی بادشاہِ ظاہر نے کوئی عبرت نہ پکڑی بلکہ اپنے حرم میں مظلوم کنواری لڑکیوں کا مزید اضافہ کیا۔تیسری اور آخری مرتبہ ہم نے اسے شدید بیمار کر دیا اور اس کے خلاف ملک میں بغاوت کرا دی بیماری

یں اس کی ایک آنکھ جاتی رہی۔مگر بغاوت کو فرو کرنے کے لئے اس نے پہلے سے بھی زیادہ بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور غضب الٰہی سے ذرا نہ ڈرا نہ عبرت پکڑی اس بادشاہِ ظاہر پر غرض کہ اس طرح تین مرتبہ حجت تمام کر دی گئی، اب اس کے لیے ہمارے پاس رعایت کا کوئی سوال نہیں۔سوائے اس کے کہ بادشاہت ظاہری سے اسے معزول کیا جائے اور اسکی موت کا پروانہ جاری کیا جائے۔بادشاہ ظاہر پر فرد جرم یہ ہے کہ اس نے علمائے دین کو تختہ دار پر لٹکایا۔بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔کنواری جوان لڑکیوں کی کھلے عام عصمت دری کی اور اس کی دیکھا دیکھی اس کے وزراء اور سفرا نے بھی عیش وعشرت اور گناہ کا بازار گرم کیا۔اب تمام حاضرین پر اس کا فیصلہ چھوڑا جاتا ہے کہ وہ اس بادشاہ ظاہر کے لیے کیا حکم صادر فرماتے ہیں اور صدر الصدور سے دست بستہ گزارش ہے کہ وہ اس معاملے پر اپنی خاص توجہ فرمائیں۔''

وہ بزرگ اپنی تقریر ختم کر کے اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔تمام حاضرین نے کچھ لمحے توقف کیا اور پھر یک زبان ہو کر بادشاہ ظاہر کی معزولی اور پروانہ اجل کے جاری ہونے پر زور دیا۔شاہِ جنات نے ہمیں اشارہ کیا اور ہم نے کہا۔

ہم تمام حاضرین کی رائے سے متفق ہیں۔بادشاہ ظاہر کو معزول کیا جاتا ہے اور اس کے لئے پروانہ اجل بھی جاری کیا جاتا ہے تمام حاضرین نے ''سبحان اللہ'' کہا اور غائب ہو گئے۔

اب صرف ہم اور شاہِ جنات حضرت سلیمان رہ گئے شاہ جنات نے

فرمایا۔ ''ہم آگاہ ہیں کہ اس وقت تمہارا مقصد دھرم پور پہنچنے کا ہے۔ لیکن سنو! ایک نصیحت تمہارے لئے ضروری بھی ہے وہ یہ کہ حتی الامکان یہ کوشش کرنا کہ تمہارا کوئی بھی قصد یا عمل مرضی مولا کے خلاف نہ ہو اب تم آنکھیں بند کرو، تم جہاں کا بھی قصد کرو گے پہنچ جاؤ گے۔''

ہم نے ایسا ہی کیا۔ آنکھ کھلی تو ہم نے اپنے آپ کو یہاں پایا۔ ہم نے یہ سب تم لوگوں کو اس لیے بتایا کہ ہماری نیت پر تم شک نہ کرو، ورنہ اسرار الٰہی فاش کرنے کا ہمیں حکم نہیں'' ہم نے یہاں فضل داد مرحوم پر توجہ فرمائی ہماری توجہ کا مقصد یہ تھا کہ اگر فضل داد مرحوم میں ابھی تھوڑی بہت جان باقی ہو یا روح جسم کے کسی بھی حصے میں موجود ہو وہ زندہ ہو جائے، مگر ہم نے دیکھا کہ ہماری توجہ سے فضل داد مرحوم کا جسم ایک بار بہت زور سے کانپا اور سرد ہو گیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ جسم میں روح باقی تھی بلکہ یہ سب ہماری توجہ کا اثر تھا۔ یہی دیکھ کر تو زرینہ کی چیخ نکل گئی تھی۔ اگر ہم کچھ دیر اور توجہ کرتے تو فضل داد مرحوم دوبارہ زندہ ہو جاتا، مگر ایسا کرنا مرضی مولا کے خلاف ہوتا، اس لئے ہم نے ایسا نہیں کیا۔ مارنا اور جلانا اللہ ہی کو زیب دیتا ہے اور اسی کے اختیار میں ہے اللہ اگر چاہے تو......''

ابھی پیر صاحب کا سلسلہ کلام جاری ہی تھا کہ ایک آواز گونجی ۔'' بکتا ہے۔ صرف نری بکواس کرتا ہے ورنہ جسے درگا مائی کے چیلے بھسم کر دیں اسے کون جیون دے سکتا ہے۔''

یہ آواز گنگا پرشاد کی تھی جو غالبًا اپنے شکار پر اپنی فتح کا نظارہ کرنے آئے

تھے تا کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ ان کے منتر کا کیا اثر ہوا۔ جب انہوں نے یہاں پیر صاحب کو دیکھا تو آگ بگولہ ہو گئے اس لئے کہ پیر صاحب سے ان کی پرانی دشمنی تھی، اس وقت سے جب سے کہ ان کا لڑکا پیارے لال پیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوا تھا اور اس کا نام بھی پیر صاحب نے بدل کر شریف علی رکھ دیا تھا۔ اب سے کوئی پانچ سال پہلے بھی پیر صاحب اس قصبے میں تشریف لائے تھے اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہو کر بہت سے لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے جن میں پنڈت گنگا پرشاد کا لڑکا پیارے لال بھی شامل تھا، پنڈت جی نے لاکھ کوشش کی تھی کہ پیارے لال اپنے دھرم پر واپس آ جائے۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ تھوڑے دن بعد پیر صاحب خود بہ خود دھرم پور چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے۔ اس کے بعد اب تشریف لائے تھے۔ ان کے جانے کے بعد پنڈت جی نے مشہور کر دیا تھا کہ پیر صاحب ان سے ڈر کر قصبہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔ مگر آج جب اچانک پنڈت جی نے اپنے دشمن کو اس طرح دیکھا تو ان کا خون کھول گیا اور چیخ پڑے۔ پنڈت جی کی آواز سن کر تمام لوگ خوف زدہ رہ گئے اور ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس وقت پنڈت جی انہیں بڑے خوفناک لگ رہے تھے اس مجمع میں ان کا اپنا بیٹا پیارے لال (جو اب شریف علی کے نام سے جانا جاتا تھا) بھی موجود تھا، اس نے جب اپنے باپ کی یہ حالت دیکھی تو آگے بڑھ کر ان کے قدموں پر گر پڑا اور کہا۔

''خدا کے لئے آپ واپس چلے جایئے۔''

پنڈت جی یہ سن کر اور غضب ناک ہو گئے اور اس کے سر پر ایک ٹھوکر ماری اور چیخے۔

''اٹھ جا میرے چرنوں سے میرا دھرم نشٹ کرتا ہے پاپی، میں آج یہ دیکھ کر ہی جاؤں گا کہ یہ پیر کا بچہ میرے مارے ہوئے کو کس طرح دوبارہ جیون دے سکتا ہے۔''

''خاموش مردود'' ایک کڑک دار آواز کمرے میں گونجی اور مع پنڈت جی کے سب مبہوت رہ گئے اس لئے کہ یہ آواز سو فیصدی مولوی فضل داد کی تھی......اس عرصے میں پیر صاحب نے مولوی فضل داد پر پوری توجہ دی تھی۔ جبھی وہ دوبارہ زندہ ہو کر اپنی چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ اس وقت انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے گہری نیند سے اٹھے ہوں۔ تمام حاضرین یہ تماشا دیکھ کر سکتے میں رہ گئے اور پنڈت جی ''جے درگامائی۔ جے درگامائی'' پکارتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

پیر صاحب نے مولوی فضل داد مرحوم کی طرف دیکھا اور فرمایا ''بس فضل داد بس! اللہ کے حکم سے اپنی قسمت کو قبول کرو''۔ یہ سنتے ہی فضل داد مرحوم کا جسم دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں...... ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پیر صاحب نے فرمایا۔

اس کے بعد مولوی فضل داد کی تجہیز و تکفین کی گئی پیر صاحب شریف علی کے گھر قیام پذیر ہوئے۔ پیر صاحب کی کرامت کا چرچا نہ صرف دھرم پور بلکہ اس کے

گرد و نواح تک بھی پہنچ گیا اور پیر صاحب کی زیارت سے فیض یاب ہونے کے لئے دھرم پور میں ایک میلہ سا لگ گیا۔ آخرکار ایک دن پیر صاحب نے فرمایا کہ ''بس اب ہمیں یہاں قیام کرنے کا زیادہ حکم نہیں، کل ہم چلے جائیں گے''۔

اس تمام عرصے میں قصبے کے لوگ جیسے پنڈت جی کے وجود کو بھول ہی گئے تھے۔ مگر جب انہوں نے یہ سنا کہ پیر صاحب تشریف لے جا رہے ہیں تو انہیں یکایک پنڈت جی کا خیال آیا، اس عرصے میں پندت جی کو کسی نے اپنی گڑھی سے باہر نکلتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ دن رات اپنی گڑھی میں رہتے تھے اور ایک لمحے کو بھی باہر نہ نکلتے اس لئے لوگ اس مدت میں ان کے وجود کو ہی بھول بیٹھے تھے لیکن اب جب کہ پیر صاحب کے جانے کے بارے میں انہوں نے سنا تو انہیں پنڈت جی یاد آئے اور پنڈت جی کے ساتھ ساتھ ہی ان کے ظلم و ستم کا بھی انہیں خیال آیا۔ ان سب نے جس میں ہندو اور مسلمان سبھی تھے فیصلہ کیا کہ پیر صاحب سے ملیں اور اس سلسلے میں انکے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کریں کہ انکے بغیر کہیں ایسا نہ ہو کہ پنڈت جی پھر لوگوں کو ستانا شروع کر دیں ادھر تو یہ لوگ تیاریاں کر رہے تھے ادھر پنڈت جی کسی اور ہی فکر میں تھے وہ روز رات کو اٹھ کر گڑھی کے پچھلے دروازے سے قصبے کے قریبی مرگھٹ میں جاتے اور طرح طرح کے منتروں کا جاپ کرتے۔ یہ راز اس طرح کھلا کہ جس رات کی صبح پیر صاحب تشریف لے جانے والے تھے اور لوگ ان سے ملنے والے تھے اسی رات تقریباً ۱۲ بجے انہوں نے زمین میں کچھ جھٹکے محسوس کیے تمام بستی جاگ گئی لوگوں نے دیکھا کہ مرگھٹ کی

طرف سے شعلے لپک لپک کر بستی کی طرف آتے ہیں اور زمین میں دھنس کر غائب
ہوجاتے ہیں۔جس سے زمین میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔تمام قصبے میں جاگ ہوگئی
۔تمام ہندو اور مسلمان اپنے گھروں سے نکل پڑے اور کھلے میدان میں آگئے تاکہ
اگر زلزلے سے مکانات گریں تو وہ محفوظ رہ سکیں ایک عجیب کہرام اور بھگڈر مچ گئی
پہلے تو لوگ یہی سمجھے کہ واقعی زلزلہ آگیا ہے...... مسلمان مسجد میں اذان دینے لگے
اور ہندو مندر میں گھنٹے بجانے لگے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ کچھ اور ہی سلسلہ
ہے اور شعلے بستی کی طرف لپک کر آرہے ہیں تو وہ اور بھی خوف زدہ ہوگئے۔

مرگھٹ کی طرف سے شعلے لپکتے رہے، اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ پیر
صاحب ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے آرہے ہیں اور انکے ساتھ شریف علی بھی پیچھے
پیچھے بھاگتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔پیر صاحب نے بھی یہ منظر دیکھا اور ایک دم
جیسے ان پر کیفیت سی طاری ہوگئی انہوں نے سب کے سامنے کلمہ شہادت اپنے
سیدھے ہاتھ کی پہلی انگلی پر دم کیا اور اس انگلی کو بلند کرکے ایک دم زمین پر رکھ کر
فرمایا۔

''اے زمین تو کس کے حکم سے ہلتی ہے'' جواب دے ورنہ ساکت ہو
جا''۔

پیر صاحب کا یہ کہنا تھا کہ زمین ایک دم ساکت ہوگئی مگر مرگھٹ کی طرف
سے شعلے اب بھی لپک رہے تھے اور آ آ کر زمین میں جذب ہورہے تھے۔لیکن
اب زمین ہلنا قطعی بند ہوچکی تھی شعلے بے اثر ہوگئے تھے۔پیر صاحب نے کچھ پڑھ

کر مرگھٹ کی طرف پھونکا اب کے جو شعلے لپک کر آئے تو اسی طرح مرگھٹ ہی کی
طرف واپس چلے گئے۔کچھ دیر تک یہی ہوتا رہا شعلے لپک کر آتے اور مرگھٹ ہی کی
طرف واپس ہوجاتے۔پیر صاحب وقفے وقفے سے کچھ پڑھ پڑھ کر مرگھٹ کی
طرف پھونکتے...... آخر کار پیر صاحب نے ایک بار زور سے حق کا نعرہ بلند کیا اور
اپنا سیدھا ہاتھ مرگھٹ کی سمت کردیا۔انکے دست مبارک سے ایک دودھیا روشنی سی
پھوٹی۔اور شعلوں کی طرف لپکی۔ادھر دودھیا روشنی بڑھی ادھر سے شعلے لپکے اور
آپس میں ٹکرا گئے۔بڑے زور کی کڑک سنائی دی جیسے کہیں بجلی گری ہو دودھیا روشنی
نے شعلوں کے گرد حصار قائم کرلیا۔رفتہ رفتہ شعلے اس دودھیا روشنی میں بالکل
چھپ گئے، اس کے بعد وہ دودھیا روشنی آسمان کی طرف بلند ہوکر نظروں سے
غائب ہوگئی۔

اب لوگوں کو جیسے ہوش آیا۔ایک جذبہ ممنونیت سے وہ پیر صاحب کو
دیکھنے لگے اور ان کے گرد جمع ہوگئے...... پیر صاحب نے فرمایا۔

''جو کچھ ہوا اسے بھول جایئے۔مجھ میں کچھ بھی نہیں سب اللہ کی طاقت
ہے۔سب اسی کا اختیار ہے ہم تو سب اللہ کے آلۂ کار اور ادنیٰ بندے ہیں، اب
اپنے اپنے گھروں کو جایئے اور آرام کیجئے، اب کچھ نہیں ہوگا۔کل صبح بعد نماز فجر ہم
اس سارے ہنگامے کی وجہ بیان کریں گے۔ہمیں ابھی یہاں مزید قیام کرنا پڑے
گا۔مرضی مولا کے آگے دم مارنے کا یارا ہمیں کہاں۔

یہ مژدہ سن کر کہ پیر صاحب ابھی اور قیام فرمائیں گے...... تمام قصبے

والوں کو سکون ہوا اور ان کی ڈھارس بندھی وہ خود یہی سوچ رہے تھے کہ پیر صاحب سے ابھی مزید ٹھہرنے کی گزارش کریں۔ وہ پیر صاحب کے حکم پر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے

صبح ہوتے ہی تمام لوگ مسجد کے اندر اور باہر جمع ہو گئے۔ پیر صاحب فجر کی نماز ادا کر کے مسجد کے باہر تشریف لائے۔ جہاں مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی جمع تھے پیر صاحب نے فرمایا۔

''میں اس سے آگاہ ہوں کہ یہ تمام فساد جو رات کو برپا ہوا اس میں پنڈت گنگا پرشاد کا ہاتھ ہے خدا انہیں ہدایت فرمائے۔ اس کے علاوہ میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ لیکن روز روز کے یہ معرکے کسی بھی طرح بستی والوں کے لئے مناسب نہیں۔ اگر اللہ کے حکم سے اس وقت ہم یہاں نہ ہوئے ہوتے اور ہمارے ساتھ ساتھ اللہ کی مدد نہ ہوتی تو تمام قصبہ الٹ جاتا۔ پنڈت جی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اتنے آدمیوں کی ہلاکت کا سبب بنیں۔ آپ لوگوں کو چاہئے کہ انہیں سمجھائیں کہ وہ اپنے شیطانی ارادوں سے باز آجائیں اسی میں ان کی بھلائی ہے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ان پر قہر الٰہی نازل ہو۔ دوسرا سبب ان کے ساتھ رعایت کرنے کا یہ ہے کہ ان کے لختِ جگر نورِ نظر شریف علی سابق پیارے لال ہمارے حلقہ ارادت میں شامل ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ وہ اپنے باپ کے سائے سے محروم ہو اور اس کے دل کو رنج لاحق ہو، سو ہم آپ لوگوں سے عرض کرتے ہیں کہ پنڈت جی کو سمجھائیں' بس ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔''

یہ سن کر لوگ منتشر ہو گئے۔ اور ان میں سے کچھ سربرآوردہ لوگ جن میں ہندو اور مسلمان سبھی شریک تھے پنڈت جی کی گڑھی کی طرف روانہ ہوئے۔ گڑھی میں داخل ہو کر انہوں نے دیکھا کہ گڑھی سونی پڑی ہوئی ہے وہ اور اندر بڑھے' بغیچے میں ہوتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے اور پنڈت جی کو آوازیں دینا شروع کیں، مگر ان کی کسی آواز کا جواب نہ آیا، وہ اس بات سے تو آگاہ ہی تھے کہ گڑھی میں کوئی عورت پنڈت جی کے ساتھ نہیں رہتی اس لئے وہ بے کھٹکے پنڈت جی کو آوازیں دیتے ہوئے ان کے کمرہ خاص تک پہنچ گئے۔ جیسے ہی وہ اس کمرے میں داخل ہونے کو ہوئے ایک بہت زور کی پھنکار انہیں سنائی دی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹے، انہوں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا اژدہا دروازے کے بیچوں بیچ سر اٹھائے پھنکار رہا ہے اور کمرے کے بیچوں بیچ ایک حصار کھینچا ہوا ہے جس کے باہر چاروں طرف کیڑے مکوڑے سانپ بچھو رینگ رہے ہیں۔ اور حصار کے اندر پنڈت جی اکڑے ہوئے بیٹھے ہیں ان کا منہ اور آنکھیں کھلی ہوئی ہیں...... جسم ایک دم اکڑ گیا ہے۔ آلتی پالتی مارے بالکل کسی بت کی طرح بیٹھے ہیں جیسے پتھر کے ہوں۔ تمام لوگ یہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے' انہوں نے جو منظر دیکھا تھا وہ بہت ہیبت ناک تھا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ پنڈت جی چل بسے، وہ الٹے پاؤں گڑھی سے لوٹے اور یہ خبر پیر صاحب کو سنائی۔

جب یہ اطلاع لوگ پیر صاحب کو دے رہے تھے اس وقت پنڈت جی کے صاحبزادے یعنی میرے دادا شریف علی بھی پیر صاحب کے پاس موجود تھے، وہ

یہ سن کر بہت بیتاب ہوئے اور پیر سے صاحب سے التجا کرنے لگے کہ حضور کچھ کیجئے۔ یہ کیا ہو گیا۔

پیر صاحب نے فرمایا۔ ''جو خدا کی مرضی ...... اس کے آگے کس کی مجال ہے جو چوں چرا کرے۔ کیا پنڈت جی اور کیا ہم ...... ویسے ہم چل کر ملاحظہ کرتے ہیں کہ ماجرا کیا ہے، ہم پر تو ابھی ایسا کچھ انکشاف نہیں ہوا کہ پنڈت جی اس دنیا سے سدھار گئے چلو چل کر دیکھتے ہیں۔'' یہ کہہ کر پیر صاحب اپنا عصا لے کر اٹھے اور تمام حضرات کے ساتھ گڑھی کی طرف روانہ ہو گئے۔

گڑھی پہنچ کر پیر صاحب نے جیسے ہی اس کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی وہ اژدہا جو دروازے پر تعینات تھا۔ بڑے زور سے پھنکار مار کر بہت تیزی سے پیر صاحب کی طرف بڑھا۔ تمام لوگ یہ دیکھ کر الٹے پاؤں بھاگے۔ مگر پیر صاحب نے کچھ پڑھ کر عصا بلند کیا اور اژدہے کے سر پر رکھدیا...... یہ دیکھتے ہی دیکھتے اژدہا پیر صاحب کے قدموں پر گر کر سر پٹکنے لگا۔ اور ٹھنڈا ہو گیا' اس کا ٹھنڈا ہونا تھا کہ حصار کے گرد جو کیڑے مکوڑے، بچھو اور سانپ رینگ رہے تھے وہ پیر صاحب کی سمت لپکے۔ پیر صاحب نے جلدی سے اپنے عصا سے ان کے اور اپنے درمیان ایک لکیر کھینچ لی اور وہ سب لکیر کے ادھر ہی اپنے اپنے پھن کاڑھ کر کھڑے ہو گئے، کالے کالے بڑے پھنوں والے سانپ اور لمبے لمبے ڈنگوں والے بڑے بڑے بچھو' پیر صاحب نے پھر کچھ پڑھ کر ان سب کی طرف پھونک ماری۔ پیر صاحب کا پھونک مارنا تھا کہ ایک دم ان سب کے پھنوں اور ڈنگوں میں آگ لگ

گئی اور پلک جھپکتے سب کے سب راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ یہ دیکھ کر کمرے سے باہر کھڑے ہوئے باقی حضرات کی ہمت بندھی اور وہ اژدہے کے مردہ جسم کو پھلانگ پھلانگ کر ایک ایک کر کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ پیر صاحب آگے بڑھے اور حصار کے باہر رک گئے، پنڈت جی کے اکڑے ہوئے جسم کو غور سے دیکھ رہے تھے جو بالکل مردہ اور اکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مڑ کر شریف علی سے فرمایا۔

''یہ مرے نہیں زندہ ہیں۔''

''کیا......؟'' شریف علی کے ساتھ ہی اور لوگ بھی سوال بن گئے۔ پیر صاحب نے فرمایا۔

یہ مرے نہیں بلکہ جس دم کر کے بیٹھ گئے ہیں...... لیکن یہ اب کبھی بیدار نہیں ہو سکیں گے۔ کیونکہ ان کے سارے بیر ہم نے فنا کر دیے۔ جن کو انہوں نے اپنی حفاظت اور دوبارہ بیدار کرنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ یہ اس وقت تک بالکل مردہ رہیں گے، جب تک کوئی مرد کامل ان پر توجہ نہیں کرتا، ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کے جسم اسی طرح رہے گا، گلے سڑے گا نہیں''۔

''انہیں ایسا کس نے کر دیا؟'' شریف علی نے دریافت کیا۔ پیر صاحب نے فرمایا۔

''کسی نے بھی نہیں، انہوں نے اپنی یہ حالت بنائی ہے۔ غالباً رات کے واقعے کے بعد انہوں نے اپنی حفاظت کیلئے یہ سب انتظام کیا ہے...... مگر اللہ جل شانہ کے حکم کے آگے کس کی چلتی ہے۔ اب یہ دوسروں کے رحم وکرم پر ہیں، اب

آپ لوگ جیسا کہیں ہم کریں کہیں تو انہیں زندگی عطا کر دیں ورنہ اسی حال میں رہنے دیں''۔

پیر صاحب کی بات سن کر لوگ آپس میں مشورہ کرنے لگے کچھ کا خیال تھا کا اس فتنے کو یوں ہی رہنے دیا جائے اور دوبارہ نہ چھیڑا جائے۔ کچھ رحم دل حضرات جن میں شریف علی بھی شامل تھے اسکے حق میں تھے کہ انہیں پہلی سی حالت میں لے آیا جائے اور تنبیہ کر دی جائے کہ آئندہ اپنے شیطانی ارادوں سے باز آ جائیں۔ زیادہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی تھی جو چاہتے تھے کہ پنڈت جی کو انکی پہلی حالت پر واپس لے آیا جائے۔ دراصل پیر صاحب کا بھی یہی منشا تھا۔ پیر صاحب نے ایک مرتبہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھا۔ اور پنڈت جی پر توجہ فرمائی۔ انہوں نے پنڈت جی کی کھلی ہوئی آنکھوں آنکھیں ڈال دیں کچھ لمحے بعد ہی لوگوں نے دیکھا کہ پنڈت جی کا جسم ڈھیلا ہونا شروع ہوا اور آہستہ آہستہ ان کا منہ بند ہوا پھر آنکھیں' اور کچھ لمحے بعد ہی انہوں نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں، آنکھیں کھول کر انہوں نے پیر صاحب کو دیکھتے ہی جے درگامائی کا نعرہ مارا، ایک دم محسوس ہوا جیسے ہزاروں خبیث روحیں ایک ساتھ چیخ پڑی ہوں۔ اور پھر پنڈت جی چیخے۔

''ہے ناگ دیوتا پلٹ' ہے اگنی مائی درشن!...... درشن۔'' پنڈت جی کا اتنا کہتے ہی یکا یک کمرہ تیز روشنی سے بھر گیا اور مردہ اژدہا ایک دم پھنکارتا ہوا پیر صاحب کی طرف بڑھا اور تیز روشنی ہوتے ہی پیر صاحب کے چغے میں آگ لگ

گئی پیر صاحب بوکھلا سے گئے۔ لوگوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے پنڈت جی کی آنکھوں سے دو شعلے نکلے اور پیر صاحب کے جسم سے لپٹ گئے یہ منظر دیکھ کر تمام لوگ سوائے شریف علی کے ہیبت سے چیختے ہوئے باہر بھاگ گئے۔ پنڈت گنگا پرشاد کی کڑک دار آواز پھر سنائی دی۔ وہ شریف علی کی طرف دیکھ کر گرجے۔

''نکل جا دشٹ تو بھی یہاں سے نکل جا، ورنہ تیرے پیر کی طرح تجھے بھی بھسم کر دوں گا''۔

یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا۔ پیر صاحب نے ایک ہی لمحے میں جلتا ہوا چغہ اتار کر اژدہے پر پھینکا اور ''الا اللہ'' کہہ کر پنڈت جی کے کھینچے ہوئے حصار میں داخل ہو گئے' حصار میں داخل ہوتے ہی پیر صاحب کے بڑے بڑے گیسوؤں اور داڑھی میں خود بخود آگ لگ گئی اور پنڈت گنگا پرشاد کا قہقہہ بلند ہوا۔

''رات بچ گیا' مگر اب خود جال میں پھنس گیا' اب بول کیا کہتا ہے؟''۔

یہ سن کر پیر صاحب نے ایک دم نعرہ مارا ''یا شاہ جنات مدد'' نعرہ مار کر اکڑوں بیٹھ' دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ مبارک پیٹنے لگے تقریباً اس وقت آدھے سر کے بال اور آدھی داڑھی بھی جل چکی تھی نعرہ مارتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ بادل زور سے گرجے اور یہ تندور کی طرح آگ کمرہ ایک دم نہایت ٹھنڈک سے بھر گیا خود بخود پیر صاحب کی داڑھی اور سر کے بال جلنا بند ہو گئے۔

اب وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ اژدہا جل کر خاک ہو چکا ہے۔ حصار کا نشان بھی غائب ہے اور پنڈت جی زمین پر گر کر تڑپ رہے ہیں

۔دھیرے دھیرے کمرہ اپنی پہلی حرارت پر آ گیا اس وقت نہ کمرہ تیز گرم تھا نہ برف کی طرح ٹھنڈا پنڈت جی کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی تڑپ رہے تھے اور ان کے منہ سے خرخر کی آوازیں آ رہی تھیں یہ دیکھ کر شریف علی کا دل ایک دم باپ کے لئے تڑپا اور وہ ان کے قریب جا کر بیتابی سے بولے۔

''ابا! ابا...... کیا ہوا آبا؟...... کچھ تو بتایئے؟..... کچھ تو بولئے...... کیا تکلیف ہے آپ کو؟ پنڈت جی تڑپتے تڑپتے ہی ایک دم غرآئے۔'' پتا جی کہہ! پتا جی' پیارے لال۔''

شریف علی تڑپ کر بولے۔'' پتا جی پتا جی۔ کیا ہوا آپ کو؟''

پنڈت جی کی آواز پھر بھنچ گئی اور وہ خرخر کرنے لگے ایسا لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر آواز نہیں نکل رہی یہ دیکھ کر شریف علی نے پیر صاحب کا دامن تھام کر فریاد کی۔

''مرشد' مرشد! خدا کے لئے انہیں بچا لیجئے۔ آپ کو اپنی رحم دلی کی قسم''۔

پیر صاحب کے ہونٹ ہلے انہوں نے ہونٹوں میں کچھ پڑھا اور داہنا ہاتھ آگے بڑھا کر فرمایا'' قرار' قرار!'' اور ان لفظوں کے ساتھ ہی پنڈت جی یکا یک تڑپتے تڑپتے بے ہوش ہو گئے۔'' چلو'' پیر صاحب نے شریف علی سے فرمایا۔

''مگر...... ؟'' شریف علی نے پس و پیش کیا۔

پیر صاحب نے پھر فرمایا۔ چلو! ہم نے تم سے جو کہا ہے شریف علی! اس پر

عمل کرو! یہ شام تک اپنی حالت پر آ جائیں گے جلدی چلو! ہم اس سارے ہنگامے میں بھول ہی گئے تھے کہ آج ہمارے وصال کا دن ہے ہماری عمر آج پورے چار سو سال ہو گئی مگر ایسا لگتا ہے کہ جیسے باری تعالیٰ ہمیں ایک مرتبہ اور زندگی عطاء کرنا چاہتا ہے ورنہ شاہ جنات ہمیں منصب جلیل نہ عطا فرماتے۔ چلو! جلدی کرو عصر اور مغرب کے درمیان ہمیں اس فانی دنیا سے کوچ کر جانا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ وقت آئے ہم ایک مرتبہ شاہ جناب حضرت سلیمان کی بارہ گاہ کوہ قاف جانا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے وہ آئندہ سو سال کے لئے ہماری توسیع عمر مزید کرا دیں ویسے ہم خود ایسا نہیں چاہتے البتہ اگر شاہ جناب کا حکم ہوا اور وہ باری تعالیٰ سے اجازت لے چکے ہوں گے تو مجبوراً ہمیں اس دار فانی میں سو سال مزید قیام کرنا پڑے گا...... ورنہ وصال تو لازمی ہے۔ رکو نہیں تیز تیز چلو...... ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔



پیر صاحب اور شریف علی مکان پر پہنچے۔ کچھ دیر بعد عصر کی اذان ہوگئی۔
پیر صاحب نے نماز ادا کی اور کچھ پڑھ کر اپنے پر دم کیا۔ دم کرنا تھا کہ شریف علی کے دیکھتے ہی دیکھتے پیر صاحب آنکھوں سے اوجھل ہو گئے شریف علی نے خالی مصلے کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگے کہ اے اللہ پیر صاحب کی عمر میں مزید سو (100) سال کی توسیع کر دے۔ وہ سوچنے لگے خدا کرے شاہ جنات نے اللہ تعالیٰ سے پیر صاحب کی توسیع عمر کے بارے میں اجازت لے لی ہو۔ وہ ابھی اتنا ہی سوچ پائے تھے کہ ہوا کا بہت زور کا جھونکا آیا ب ایک لمحے کے لئے ان کی آنکھیں جھپک گئیں اب جو دوبارہ پلکیں اٹھائیں دیکھا پیر صاحب مصلے پر سجدے میں پڑے ہیں وہ یہ سب دیکھ کر حیران رہ گئے پیر صاحب نے تھوڑی دیر کے بعد سجدے سے سر اٹھایا اور فرمایا۔ ''مبارک شریف علی! جیسا کہ ہمارا خیال تھا ویسا ہی ہوا۔ شاہ جنات حضرت سلیمانؑ نے اللہ تبارک تعالیٰ سے ہمیں مزید (100) سو سال کے لئے مانگ لیا۔'' شریف علی فرط مسرت سے ایک دم پیر

صاحب کی طرف لپکے اور انکا دست مبارک لیکر اپنی آنکھوں سے لگایا اور چوما پیر
صاحب نے شریف علی کی یہ محبت دیکھی تو اٹھ کر کھڑے ہوئے اور شریف علی کو سینے
سے لگالیا۔شریف علی پیر صاحب کے سینے لگ کر ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ہواؤں میں
تحلیل ہوتے جا رہے ہوں۔اور نہ جانے کتنے سال سے اسی طرح پیر صاحب کے
سینے سے لگے ہوئے ہوں۔یہاں تک کہ پیر صاحب نے انہیں علیحدہ کیا اور دست
مبارک سر پر پھیرا پھر فرمایا۔''میرے بچے تم پر خدا کی رحمت ہو! اللہ نے تمہارے
لئے بہت بڑی ذمہ داری مقدر کی ہے وہ ذمہ داری یہ ہے کہ اب سے کچھ دیر بعد ہم
اپنا یہ جسم خاکی تبدیل کر دیں گے اور تمہیں اس کی کم از کم چالیس دن حفاظت کرنا
ہوگی یعنی ہمارے نئے جسم کی۔۔۔۔۔''

''وہ کس طرح۔؟'' شریف علی نے کہا۔''ہم تمہیں سب کچھ بتاتے ہیں
۔ویسے تم ابھی کچھ دیر کے بعد سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے۔مگر پہلے ایک
ضروری بات سنو! ممکن ہے ہمارے لئے تم کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہے۔جب تم
ایسا محسوس کرو تو ہم تمہیں ایک عمل تعلیم کرتے ہیں یہ پڑھ کر تم ہم پر پھونک دینا اس
سے یہ ہوگا کہ ہمارے جسم کے چاروں طرف ایک نورانی ہالہ کھینچ جائے گا جس میں
صرف تم داخل ہوسکو گے تمہارے سوا اور کوئی نہیں۔اس نورانی ہالے کے اندر ہم پر
کوئی بھی شیطانی عمل اثر انداز نہیں ہوگا۔ہمارا نیا جسم شروع شروع میں بہت نرم و
نازک ہوگا جس کے لئے بہت احتیاط کی ضرورت ہے تمہارے یہاں غالباً کسی
لحاف کی روئی تو ہوگی ہی ....''جی ہاں'' شریف علی نے کہا ''تو لے

آؤ'' ....پیر صاحب نے فرمایا شریف علی ایک لحاف اٹھالائے اور پیر صاحب
کے سامنے پیش کیا۔پیر صاحب نے اس کا ابرا اور استر چاک کیا روئی کو مسہری پر
بچھا دیا پھر ایک چادر طلب کی وہ بھی شریف علی نے پیش کر دی پھر صاحب نے چادر
مسہری کے پائنتی رکھدی اور فرمایا''بس ہم تمہیں وہ عمل تعلیم کرتے ہیں وقت کم ہے
مغرب قریب ہے۔اور ہاں سنو! ہمارا یہ جسم تم کسی سفید چادر میں جمع کر کے قریبی
قبرستان میں دفن کرآنا اور ہاں ہماری خوراک چالیس دن تک صرف دودھ پر منحصر
ہوگی۔ پہلے تین دن ہمیں تم دودھ میں روٹی ڈبو ڈبو کر دودھ پلانا پھر سات دن
چمچوں سے دس دن کے بعد کٹورے سے بھی پلا سکتے ہو اس لئے کہ دس دن کے بعد
ہم اس قابل ہوسکیں گے کہ تھوڑا بہت اٹھ سکیں...... آؤ! ادھر آؤ ہم تمہیں عمل تعلیم
کریں۔''

شریف علی پیر صاحب کے نزدیک چلے گئے اور پیر صاحب انہیں
دھیرے دھیرے عمل تعلیم کرتے رہے۔شریف علی کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا سینہ
نور سے بھر گیا ہو۔''اچھا اب ہم اس جسم کو خیر باد کہتے ہیں خدا حافظ۔'' پیر صاحب
نے یہ الفاظ ادا فرمائے اور مسہری پر دراز ہوگئے۔ایک زور کا نعرہ مارا''الا اللہ''
اور شریف علی نے دیکھا کہ پیر صاحب کا جسم بیچ سے شق ہوگیا مگر حیرت کی بات یہ
تھی کہ ایک قطرہ خون بھی نہ ٹپکا۔شریف علی نے دیکھا کہ پیر صاحب کا چہرہ مبارک
ایک دم پھٹا اور دو حصوں میں تقسیم ہونے لگا۔اب جو شریف علی نے غور کیا تو دیکھا
کہ پیر صاحب کے جسم مبارک سے ایک اور جسم بالکل سرخ و سفید نمودار ہو رہا ہے

اور دیکھتے ہی دیکھتے سرخ و سفید جسم جو کسی بھی طرح پیر صاحب کا نہ معلوم ہوتا تھا ۔ پوری طرح نمودار ہوگیا۔ شریف علی مبہوت رہ گئے ایسا حسن و خوبصورت جسم انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ رفتہ رفتہ پیر صاحب کا قدیم جسم چھلکنے کی طرح اس نئے جسم سے علیحدہ ہوگیا اور مسہری سے نیچے گر پڑا ۔ شریف علی نے فوراً حسب الحکم ایک سفید چادر میں اس قدیم جسم کو سمیٹ لیا۔

اب شریف علی نے پیر صاحب کے نئے جوان جسم کو دیکھا بالکل برہنہ سرخ و سفید جسم کسی سولہ سال کے جوان لڑکے کا جسم۔ یہ جسم دیکھ کر شریف علی کی کیفیت نشے کی سی ہوگئی جسم آفاق تابناک اور حسین تھا وہ خواب کے سے عالم میں آگے بڑھے اور جسم پر چادر ڈال دی سفید چادر میں پیر صاحب کا قدیم جسم اٹھا کر وہ کمرے سے باہر نکلے کمرے کو مقفل کیا اور قبرستان کی راہ لی۔

اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ شریف علی کچی پکی گلیوں سے ہوتے ہوئے کھیتوں کھیتوں قبرستان پہنچے۔ دیکھا کہ تکیے کے فقیر ایک قبر کھودنے میں منہمک ہے شریف علی کے قدموں کی آواز سن کر وہ مڑا اور کہا۔'' آپ آگئے مجھے آپ ہی کا انتظار تھا۔ لائیے امانت ادھر لائیے!'' شریف علی حیرت سے اسے دیکھ کر بولے۔'' کیسی امانت میاں صاحب! میں تو کسی اور غرض سے حاضر ہوا ہوں۔'' فقیر نے کہا۔'' میں سب سمجھتا ہوں۔ ابھی کچھ دیر قبل عصر کی نماز کے کچھ دیر بعد پیر صاحب چونڈیرے شریف خود یہاں تشریف لائے تھے اور فرمایا تھا کہ شریف علی کچھ دیر بعد ہمارا جنازہ لیکر آتا ہے اس وقت تک تم قبر تیار کرو۔'' شریف

علی بولے'' مگر وہ تو میرے ساتھ تھے یہ کس طرح ....'' فقیر نے بات کاٹ کر کہا''۔ کیوں اور کس طرح کے چکر میں مت پڑو شریف علی! یہ اللہ والوں کی باتیں ہیں وہ جانیں۔ ہم تو ان کے حکم کے بندے ہیں بے چون و چرا جو وہ کریں اور جو وہ دکھائیں دیکھتے رہیں۔ عافیت اسی میں ہے۔'' یہ کہہ کر فقیر نے وہ چادر جس میں پیر صاحب کا جسم مبارک تھا شریف علی کے ہاتھوں سے لے لی اور قبر میں اتار دی اس کے بعد قبر پر تختے ڈھکنے لگا۔ جب فقیر قبر پر تختے ڈھک رہا تھا شریف علی نے ریافت کیا'' میاں صاحب! یہ تختے کون لایا ہے؟'' فقیر نے قبر سے باہر کھڑے وئے شریف علی کی طرف دیکھا اور کہا۔'' کمال ہے شریف علی! تمہیں اتنا بھی ہیں معلوم! یہ تختے تو خود پیر صاحب لائے تھے اور فرمایا تھا کہ ضرورت پڑے گی س لئے ساتھ لیتا آیا قبر کا ناپ بھی وہ خود ہی بتا گئے تھے۔''

اتنا کہہ کر فقیر نے قبر کو تختوں سے ڈھکا اور پھاوڑے سے کچھ مٹی گیلی کر کے قبر کے تختوں کے چاروں طرف ڈالنے لگا۔ جب وہ مٹی برابر کر چکا تو شریف علی نے بولا۔'' چلیئے مٹی دیجئے۔'' شریف علی اور فقیر نے قبر کو مٹی دی اور بعد فقیر نے قبر بنا دی اور فاتحہ کے لئے ہاتھ بلند کئے شریف علی نے بھی فاتحہ پڑھی اور فقیر کی مزدوری جیب سے نکال کر دینے لگے۔ فقیر بولا......'' اس کی ضرورت نہیں پیر صاحب بذات خود مجھے میری مزدوری عطاء کر گئے تھے۔ شریف علی قبرستان سے لوٹ کر گھر آئے اور بڑے اضطراب کے ساتھ جلدی سے کمرے کا قفل کھول کر مسہری کی جانب بڑھے انہوں نے دیکھا کہ پیر صاحب کا نومولود جسم ڈھیرے

دھیرے سانس لے رہا ہے انہیں یہ دیکھ کر اطمینان قلب حاصل ہوا اور پھر وہ کمرے کے کواڑ بھیڑ کر زنانے میں گئے۔۔۔ایک پیالے میں کچھ دودھ لیکر پھر کمرے میں واپس آگئے اور دودھ میں روئی بھگو بھگو کر پیر صاحب کے نئے جسم کے ہونٹوں پر ٹپکانے لگے۔ ہونٹ ذرا سے کھلے یہاں تک کہ شریف علی نے اسی طرح پورا دودھ جو کٹورے میں تھا پیر صاحب کے نئے جسم کو پلا دیا۔ دودھ پلانے کے بعد وہ دیر تک ان کے سرہانے کھڑے رہے اور اس جسم کو حیرت کے ساتھ دیکھتے رہے۔

اسی طرح تین دن گزر گئے۔ عصر کا وقت ہوگا کہ وہ مسجد سے نماز پڑھ کر نکل رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ پنڈت گنگا پرشاد سامنے سے چلے آرہے ہیں۔ شریف علی کو دیکھ کر پنڈت جی نے نہایت تضحیک آمیز انداز میں شریف علی سے کہا۔ ''کیوں دبک گیا تیرا پیر'' یہ کہہ کر پنڈت جی بہت زور سے ہنسے۔ ''میرے پاس چمتکار ہی ایسا ہے کہ بڑے بڑے پیر میرے آگے پانی بھرتے ہیں وہ تو بچ کر بھاگ ہی گیا ورنہ جلا کر بھسم کر دیتا۔ اب دیکھتا ہوں کس دن میرے آڑے آتا ہے۔ میں نے درگامائی کا جاپ شروع کر دیا ہے تو جانتا ہے اس جاپ کا کیا استھان ہے میں نے اگر یہ جاپ پورا کر لیا تو پھر تیرا ایک پیر کیا سو پیر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں جب چاہوں گا جس کے شریر پر چاہوں گا قبضہ کر لوں گا'' یہ کہہ کر پنڈت جی پھر زور سے ہنسے شریف علی یہ سب کچھ گردن جھکائے چپ چاپ سنتے رہے۔ پنڈت جی پھر بولے۔ ''بولتا کیوں نہیں؟'' ''کہاں گیا تیرا پیر؟'' شریف علی نے کہا کہ'' آپ کیوں ان سے جھگڑا مول لیتے ہیں۔ انہوں نے تو کبھی آپ پر خود و

ار کرنے میں پہل نہیں کی۔'' پنڈت جی بولے ''اس کی کیا ہمت ہے جو مجھ پر وار کرے۔ بس ذرا تیری وجہ سے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتا کہ وہ تیرا گرو ہے اور گرو پتا سمان ہوتا ہے۔ پر اب کے ہتھے چڑھ گیا تو نہیں چھوڑوں گا'' یہ کہہ کر پنڈت جی چلے گئے''۔

شریف علی پنڈت جی کی جلی کٹی سن کر آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے اپنے گھر پہنچے مگر جیسے ہی انہوں نے گھر میں قدم رکھا ان کا ماتھا ٹھنکا۔ جس کمرے میں پیر صاحب کا نومولود جسم رکھا تھا وہ کھلا پڑا تھا اور ان کا لڑکا شتاب علی یعنی میرے والد جن کی عمر اس وقت سولہ سترہ سال تھی' اس کمرے کے دروازے پر کھڑے تھے۔ شریف علی جلدی سے کمرے کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا ان کی بیوی شریفن پیر صاحب کے نومولود جسم کے پاس کھڑی ہیں جیسے ہی شریف علی کمرے میں داخل ہوئے وہ ان پر برس پڑیں۔'' یہ بڑھاپا اور یہ لچھن! تمہیں شرم نہیں آتی کرتوت کرتے ہوئے۔ اولاد برابر کی ہوگئی آخر یہ کس موئے کو گھر میں ڈال رکھا ہے جبھی تو میں کہوں کہ یہ بھر بھر کٹورا دودھ صبح شام کہاں جاتا ہے۔ اے دیکھو تو مجھے دیکھتے ہی موا کیسی آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ ننگ دھڑنگ پڑا ہے۔ بے غیرت اے اٹھ ورنہ ابھی سر پر جوتی بجاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر شریفن سچ مچ پیر کی جوتی اتار کر پیر صاحب کے نومولود جسم کی طرف بڑھیں کہ اچانک شریف علی نے چیخ کر کہا '' کیا کرتی ہے بدبخت! کیوں دین و دنیا خراب کرتی ہے'' یہ کہہ کر شریفن کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لائے۔ کمرے کا قفل لگایا اور شریفن کو اندر زنانے میں

لے گئے۔اس عرصے میں میرے والد یعنی شتاب علی گھر سے باہر چلے گئے۔شریف علی نے تمام واقعہ میری دادی یعنی شریفن کو بتایا اور کہا...... ''تو تو غضب ہی کر دیا ہے'' تمام بات سن کر شریفن کو کچھ تو یقین آیا اور کچھ نہ آیا مگر ان کے غصے میں پہلی شدت نہ رہی اور منہ پھلا کر بولیں۔''تو مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا''۔

عورتیں تو پیٹ کی ہلکی ہوتی ہی ہیں شریفن نے بی پڑوسن سے بڑے کے ساتھ پورا واقعہ بیان کیا اور بی پڑوسن نے اپنے شوہر سے اور بی پڑوسن کے شوہر ہردیال نے اپنے دوستوں سے یہی واقعہ یہ کہہ کر سنایا کہ کسی اور کو بتانا۔ اسی طرح چند ہی دن میں یہ بات تمام قصبے میں پھیل گئی کہ پیر صاحب جونڈیرے شریف دھرم پور سے گئے نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اپنا پرانا جسم چھوڑ کر ایک نیا جسم اپنا لیا ہے اور ان کا پرانا جسم قصبے کے قبرستان میں دفن ہے اور یہ بھی کہ پیر صاحب کا نیا جسم ایک سولہ سال کے جوان لڑکے کا ہے کچھ لوگوں نے قبرستان کے فقیر سے بھی اس واقعے کی تصدیق کر لی اور ہوتے ہوتے یہ تمام واقعہ پنڈت جی کے کانوں تک بھی پہنچ گیا وہ یہ سن کر بہت سٹپٹائے۔

پنڈت گنگا پرشاد تک پیر صاحب کے نومولود جسم کی اطلاح پہنچتے پہنچتے خاصہ وقت گزر چکا تھا اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ قصبے والے پنڈت جی سے کسی طرح کے تعلقات نہ رکھتے تھے بلکہ مجبوراً جب پنڈت جی کو خود کوئی کام پڑ جاتا تھا تو وہ ان سے بول لیتے تھے ورنہ نہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ان تک بات پہنچنے میں خاصہ وقت لگ گیا۔اب پیر صاحب کے نومولود جسم کو مکمل صحت

توانائی کے لئے صرف پانچ دن درکار تھے۔یہ بات پنڈت جی کو بھی معلوم ہوگئی انہوں نے سوچا کہ پانچ دن تک تو ابھی پیر صاحب کچھ نہیں کر سکتے اس لئے کیوں نہ انہیں اس پانچ ہی دن کے عرصے میں ختم کر دیا جائے۔اس کے علاوہ انہیں اپنے لڑکے شریف علی پر بھی بہت غصہ آیا جو اپنے باپ کا ساتھ چھوڑ کر پیر صاحب کی مدد کر رہا تھا۔اسی غصے میں وہ شریف علی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے انہیں اس طرح غصے میں دیکھ کر لوگ سہم گئے کہ شاید آج پھر کوئی فتنہ کھڑا ہونے والا ہے پنڈت گنگا پرشاد دندناتے ہوئے شریف علی کے گھر پہنچے اتفاق سے شریف علی اس وقت گھر پر ہی موجود تھے اور اس وقت پیر صاحب کے نومولود جسم کی مالش کر رہے تھے۔اب اس جسم نے اشاروں کنایوں سے شریف علی کو حکم دینا بھی شروع کر دیا تھا۔شاید اشاروں ہی سے شریف علی کو جسم کی مالش کے لئے کہا تھا۔جیسے ہی پنڈت گنگا پرشاد اس کمرے میں داخل ہوئے شریف علی کے پیروں سے زمین نکل گئی وہ کانپنے لگے جیسے کوئی چور عین موقع پر چوری کرتے ہوئے پکڑا جائے۔ان کی یہ حالت دیکھ کر پیر صاحب کے نومولود جسم میں حرکت ہوئی اور انہوں نے شریف علی کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے حصار کھینچنے کا اشارہ کیا یہ اشارہ پاتے ہی شریف علی نے جلدی سے وہی عمل جو پیر صاحب نے اپنا پرانا جسم چھوڑتے وقت انہیں تعلیم کیا تھا' پڑھنا شروع کر دیا عمل پڑھ کر شریف علی نے پیر صاحب کے جسم کی طرف پھونک ماری پنڈت جی کو ایسا لگا۔ جیسے شریف علی کے منہ سے ایک دودھیا روشنی سی نکلی جس نے پیر صاحب کے نومولود جسم کے گرد حصار بنا لیا پنڈت گنگا پرشاد یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے

اور حیرت سے بولے۔ تجھے بھی اس نے اپنا جیسا کرلیا۔ مگر میں اسے پھر بھی سراپ
بیئے بنا نہیں چھوڑوں گا۔ یہ کہہ کر پنڈت جی نے کچھ پڑھ کر پیر صاحب کے نومولود
جسم کی طرف پھونکا۔ ایک شعلہ سا لپک کر پیر صاحب کے نومولود جسم کے گرد کھنچے
ہوئے حصار میں مدغم ہوگیا کے بعد دیگرے کئی مرتبہ پنڈت جی نے وار کیا مگر بے
سود ہر مرتبہ دودھیا روشنی کا حصار ان کے شعلے کو نگل جاتا کئی مرتبہ ناکام ہونے کے
بعد وہ پیر پٹخ کر چیختے ہوئے یہ کہہ کر چل دیئے ''اچھا پھر دیکھوں گا اس وقت تو تجھے
میرے ہی خون نے بچالیا۔ اگر آج بھی مجھ سے باغی نہ ہوتا تو کب کا تجھے ٹھکانے
لگا چکا ہوتا''۔

پنڈت جی کے جانے کے بعد شریف علی نے ٹھنڈی سانس لی۔ اسی طرح
پانچ دن بڑی مشکل اور مصیبت میں گزرے کسی دن سارے کمرے میں سانپ ہی
سانپ بھر جاتے اور بھی رات گئے تک اس کمرے میں طرح طرح کی ڈراونی
آوازیں آتیں بھی شیر کی دھاڑ سنائی دیتی۔ جس سے شریف علی دہل جاتے اور بھی
ایسا لگتا جیسے کمرے کے فرش پر شعلوں کا رقص جاری ہے شعلے جو بار بار حصار پر
لپکتے ہیں اور اس میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ پیر صاحب کے نومولود جسم کے حکم پر
شریف علی بھی اسی کمرے میں سونے لگے تھے لیکن جب بھی وہ سونے لگتے اپنے گرد
بھی دودھیا حصار کھینچ لیتے اس طرح یہ پانچ دن گزرے اور ٹھیک پانچویں دن جب
شریف علی عصر کی نماز پڑھ کر گھر واپس آئے اور کمرے میں داخل ہوئے تو ان کے
منہ سے حیرت کی ایک چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی انہوں نے دیکھا کہ پیر صاحب کا بستر

خالی ہے اور دودھیا حصار غائب ہے اور وہ کھڑکی کے پاس دروازے کی طرف
پشت کئے کھڑے ہیں شریف علی کے قدموں کی آہٹ سے چونک کر پیر صاحب
نے مڑ کر دیکھا۔ شریف علی کے دل پر جیسے بجلی گر پڑی ان کے سامنے مردانہ حسن و
وجاہت کا شاہکار کھڑا تھا۔ سولہ سال کا بھرپور جوان جسم۔ پیر صاحب نے اپنے
بازو آگے بڑھائے اور شریف علی سے فرمایا ''آؤ شریف علی! ہمارے گلے لگ
جاؤ''۔

پیر صاحب کی آواز تھی کہ جادو۔ شریف علی کو ایسا لگا جیسے ان کے وجود میں
مٹھاس اور خوشبو کی ملی جلی ایک لہر اتر گئی ہو۔۔۔ اس سے قبل پیر صاحب کی آواز
میں یہ جادو نہ تھا۔ شریف علی بے خود سے ہو کر پیر صاحب کی طرف بڑھے اور ان
کے قدموں پر گر پڑے ان کا عالم عجیب خود سپردگی کا تھا۔ انہوں نے پیر صاحب
کے پائے مبارک کو بوسہ دیا پیر صاحب نے جھک کر شریف علی کو اپنے قدموں سے
اٹھالیا اور سینے سے لگالیا۔ شریف علی کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ شریف علی کو پیر صاحب
نے جب گلے لگا کر ان کی پیشانی پر بوسہ دیا تو انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک
کیف و بے خودی کے سمندر میں ڈوب رہے ہوں۔ وہ اسی کیفیت میں رہتے کہ
اچانک انہیں پیر صاحب کی شیریں آواز سنائی دی۔ ''شریف علی! ہوش میں آؤ! ہم
تمہارے احسان مند ہیں تم نے جس طرح ہماری خدمت کی ہے ہم اسے زندگی بھر
نہیں بھول سکتے''۔ شریف علی نے کہا۔ ''یہ حضور ہی کا احسان اور کرم ہے اور یہ کہ
مسہری پر بیٹھ گئے پیر صاحب بھی ان کے قریب ہی آ کر تشریف فرما گئے اور

فرمایا۔ ”ہمیں کچھ کپڑے چاہئیں۔ تم باہر جا کر ان کا انتظار کرو اس وقت ہم ذرا آرام کرلیں۔

پیر صاحب کی حیاتِ نو سے تمام قصبے والے آگاہ ہو چکے تھے اب پھر ان کے گرد لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ لیکن اب اس ہجوم میں فرق یہ تھا کہ اب لڑکیاں اور عورتیں زیادہ ہوا کرتی تھیں مرد بہت ہی کم۔ بظاہر اس کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور یہ کہ کسی نے اس طرف توجہ بھی نہ کی تھی مگر پیر صاحب اس سے آگاہ تھے اور وہ انہیں وقتاً فوقتاً بے وجہ آنے سے منع بھی کرتے تھے۔ صرف دھرمپور ہی نہیں آس پاس کے تمام قصبوں اور گاؤں میں پیر صاحب کی شہرت پہنچ چکی تھی اور ان کی نظر فیض اثر سے لوگ فائدہ اٹھا رہے تھے۔

یہ سب تو تھا ہی مگر اس سب سے الگ ایک فتنہ اور سر اٹھا رہا تھا وہ یہ کہ شریف علی کے سامنے ہی مولوی فضل داد مرحوم کا مکان بھی تھا اور اس بات سے صرف پیر صاحب اور زرینہ ہی واقف تھے کہ جب پیر صاحب چالیس دن کے بعد اٹھ کر چادر اوڑھے کھڑکی کے پاس آکر کھڑے ہوئے تھے تو انہوں نے دیکھا تھا کہ سامنے والے مکان کی چھت پر زرینہ اپنے بال سکھا رہی ہے۔ زرینہ نے پیر صاحب کو دیکھا اور دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی ایک ہی نظر میں ان پر عاشق ہوگئی۔ زرینہ بھی بے مثال حسن کی مالک تھی مگر پیر صاحب پر اس کا زیادہ اثر نہ ہوا۔ لیکن پیر صاحب کے نئے جسم پر جو سرخ و سفید اور نکھرا نکھرا سا تھا زرینہ دل و جان سے فدا ہوگئی اتنے میں شریف علی آگئے تھے اور پیر صاحب ان کی طرف متوجہ ہوگئے تھے

انہوں نے اس واقعے کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

پیر صاحب کے جسم تبدیل کرنے کے بارے میں زرینہ کو بھی علم ہوگیا تھا مگر وہ یہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ جس پر وہ عاشق ہوئی ہے وہ پیر صاحب ہی کا نومولود جسم ہے۔ لیکن جب رفتہ رفتہ پیر صاحب لوگوں سے ملنے جلنے لگے تو زرینہ کے علم میں یہ بات آگئی کہ وہ دراصل پیر صاحب کے نئے جسم پر فریفتہ ہوگئی ہے اس نے اپنے آپ پر بہت لعنت ملامت کی اور دل میں سوچا کہ یہ تو اس کے باپ کے پیر ہیں مگر کسی طرح بھی اس کے دل سے پیر صاحب کا خیال نہ گیا آخر مجبور ہو کر وہ ایک دن اپنی ماں کے ہمراہ پیر صاحب کی زیارت کرنے گئی اور جیسے ہی اس کی نظریں پیر صاحب سے ملیں وہ فرطِ شوق سے بے ہوش ہوگئی اس کی ماں ”میری بچی“ کہتی ہوئی اس سے لپٹ گئی اور رو رو کر کہا ”کیا ہوا میری بچی کو پیر صاحب! اللہ کچھ بتائیے!“ پیر صاحب نے فرمایا۔ ”کچھ نہیں گھبراؤ مت کریمن یہ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔ پیر صاحب اس پر جھکے اور کان میں کچھ پڑھ کر پھونکا۔ زرینہ کو ہوش آگیا آنکھ کھلتے ہی اس نے دیکھا کہ اس کا محبوب اس پر جھکا ہوا ہے تو وہ پھر بے خود سی ہوگئی اور آنکھیں بند کر کے پیر صاحب کا ہاتھ تھام لیا۔ لیٹے لیٹے ہی اس نے سب کے سامنے ان کا ہاتھ چوم لیا اور ہاتھ چوم کر سینے سے لگانے والی تھی کہ پیر صاحب نے آہستہ سے ہاتھ کھینچ لیا اور بہت شیریں لہجے میں فرمایا۔ ”کیا ہوا زرینہ! اٹھو! دیکھو! تمہاری والدہ تمہارے لئے کتنی پریشان ہیں۔“ یہ سن کر زرینہ نے آنکھیں کھولیں اور پھر ایک بھرپور نظر پیر صاحب پر ڈال کر اٹھ بیٹھی۔

اس دن کے بعد زرینہ کا معمول ہوگیا کہ وہ روز پیر صاحب کی زیارت ک
آتی، کبھی تنہا کبھی اپنی ماں کے ہمراہ۔ ایک دن اتفاق سے پیر صاحب تنہا تھے
زرینہ تو اس موقع کی تاک میں تھی جھٹ کمرے میں گھس آئی اور آتے ہی برقعہ اتا
کر پیر صاحب کے قدموں میں گرگئی اور رو رو کر اپنے آنسوؤں سے پیر صاحب
کے پاؤں تر کردیئے اپنی آنکھیں ان کے نازک نازک خوبصورت پیروں سے مل
رہی اپنے ہونٹوں سے ان کے پیر چومتی رہی پیر صاحب نے لاکھ سمجھایا۔ ''زرینہ
ہوش میں آؤ! کیا ہے کچھ تو بتاؤ! تمہیں کس نے ستایا ہے کیا ماجرا ہے؟'' گ
زرینہ اسی طرح ان کے پیروں کو چومتی رہی۔ آخر کار پیر صاحب نے ا
بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا یہ اٹھانا ہی غضب ہوگیا۔ زرینہ اٹھتے ہی پیر صاحب ک
سینے سے لگ گئی اور بے اختیار ان کے رخساروں پیشانی اور ہونٹوں پر بوسوں
بارش کردی اور ایک عجیب بے خودی کے عالم میں بڑبڑانے لگی۔ ''تو اب بھی نہیں
سمجھا! اب بھی نہیں کہ میں تجھے چاہتی ہوں۔ میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی یا
اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دے یا میرا ہو جا۔'' پیر صاحب نے بمشکل اسے خ
سے علیحدہ کیا۔ اور وہ خود بھی مبہوت سے ہو گئے انہیں ایسا لگا جیسے ساری روحا
قوت کسی نے سلب کر لی ہو اور وہ صرف سولہ سال کے ایک جوان رہ گئے ہو
۔ اس حالت میں وہ بہت گھبرائے اور چیخ کر فرمایا۔ ''یہ کیا کیا تو نے! زرینہ تو
میری چار سو سالہ ریاضیت پر پانی پھیر دیا یہ مجھے کیا ہوگیا میری ساری روحا
قوتیں کہاں گئیں میں بالکل خالی ہوگیا۔ تو مجھ سے لپٹتے ہی جل کر خاک کیوں

ہوگئی۔ آج تک تو ایسا نہیں ہوا پھر کیا وجہ ہے جو تو زندہ ہے؟ سچ بتا کیا تیرے پاس
مجھ سے بڑی کوئی روحانی قوت ہے جو تو نے اس طرح میری تمام روحانی قوتیں
سلب کر لیں جواب دے زرینہ! جواب دے! یہ تو نے مجھ پر کیا کر دیا۔ میں نے
اللہ کے کرم سے آج تک کسی سے شکست نہیں مانی۔ مجھ سے مقابلہ کر کے سینکڑوں
پیر پنڈت ٹھکانے لگ گئے مگر تو عجیب لڑکی ہے بتاتی کیوں نہیں تیرے پاس کیا
قوت ہے؟'' پیر صاحب دیوانگی کے عالم میں کہتے گئے۔ زرینہ نے خود اعتمادی
سے کہا ''ہاں میرے پاس بھی قوت ہے بہت بڑی قوت تیرے عشق کی قوت تو میں
اسکا اقرار کر کہ میرے سوا اور کسی کو نہیں چاہے گا''۔۔۔ پیر صاحب نے فرمایا
۔۔۔ ''گستاخ نہ بن! میرے دل میں سوائے اللہ۔۔۔۔۔ اللہ۔۔۔۔ ہاں
ہاں! کہہ! کہہ رک کیوں گیا؟'' زرینہ بولی۔۔۔۔ ''سوائے اللہ کے۔ سوائے
اللہ کے اور تیرے کسی کی محبت نہیں۔۔۔۔۔ کسی کی......'' یہ کہتے کہتے پیر صاحب
نے زرینہ کو اپنے آغوش میں بھینچ لیا اور اس کے ہونٹوں پر جھک گئے۔ پیر صاحب
اور زرینہ کچھ دیر ایک جان دو قالب ہو کر اسی حالت میں بے خود رہے۔ یکبارگی پیر
صاحب کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اور وہ زرینہ سے علیحدہ ہو گئے اور ان کے چہرے پر
ایک جلال سا آ گیا انہیں اس وقت ایسا محسوس ہوا جیسے ان کی ساری روحانی قوتیں
ایک دم بیدار ہو گئی ہوں وہ زور سے چیخے ''نہیں، نہیں'' میرے دل میں سوائے اللہ
کے کچھ نہیں۔ مجھے دھوکا ہوا۔ سوائے اللہ کے کچھ بھی نہیں۔ میں جان گیا زرینہ
تجھے مجھ سے عاشق صادق ہے اور تیرے پاس یہی وہ طاقت تھی جس نے ہماری

تمام روحانی قوتوں کو کچھ دیر کے لئے موقوف کر دیا تھا سن! یہ جسم خاکی فانی ہے عشق ذات لافانی سے کیا جاتا ہے' ہم جانتے ہیں تو بھی اسی ذات کا مظہر ہے .... ہم تجھے تعلیم کریں گے۔ ادھر دیکھ! ادھر میری آنکھوں میں! ''اب پیر صاحب کی تمام روحانی قوتیں پوری طرح بیدار ہو چکی تھیں۔ زرینہ نے جیسے ہی پیر صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اسے ایسا محسوس ہوا کہ اب وہ اپنی نظریں ادھر سے نہیں ہٹا سکتی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ ایک دریائے نور اسکے وجود میں اتر رہا ہے۔ رفتہ رفتہ اسے لگا کہ جیسے کوئی اس کے دل کو نور کے دریا میں غوطے دے رہا ہے وہ ایک دم ہلکی پھلکی ہوگئی اور اب جو وہاں سے اٹھی تو ایک اور ہی سرشاری اس میں تھی اب بھی وہ روز پیر صاحب کی خدمت میں حاضری دیتی تھی مگر اب اس کی آنکھوں میں پیر صاحب کے لےء ایک اور ہی احترام تھا....... اب بھولے سے بھی اس کے دل میں پیر صاحب کے لئے کوئی ایسا ویسا خیال نہ آیا۔ وہ پیر صاحب کے پاس جاتی پیر صاحب اس پر توجہ فرماتے اور ان کو زرینہ کی موجودگی میں ایسا احساس نہ ہوتا کہ ان کی روحانی قوتیں سلب ہو رہی ہیں۔

ایک دن زرینہ پیر صاحب کے یہاں ہو کر اپنے گھر جانے کے لئے گلی پار کر رہی تھی کہ ادھر سے پنڈت گنگا پرشاد کا گزر ہوا اس وقت زرینہ کا نقاب اٹھا ہوا تھا۔ پنڈت جی نے جوں ہی زرینہ کے چہرے پر نظر کی اس کے حسن سے مرعوب ہو کر اسے دیکھتے رہ گئے۔ اس کے بعد پنڈت جی اکثر اس گلی کے چکر کاٹنے لگے۔ ایک دن پھر اتفاق سے زرینہ کی مڈبھیڑ پنڈت جی سے ہوگئی۔ پنڈت جی نے اسے

آہستہ سے پکارا ''زرینہ جانی! سنو تو...! زرینہ غصے سے لال پیلی ہو کر ایک دم پلٹی۔ ''کمبخت زرینہ بیٹی کہتے ہوئے تیرا منہ دکھتا ہے۔'' پنڈت جی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''اور وہ جو تو اپنے ڈھگڑ سے روز ملنے جاتی ہے وہ کون لگتا ہے تیرا۔ میں بوڑھا ہو گیا نا اس لئے نفرت کرتی ہے۔ تجھے بھرپور جوان چاہئیں۔ وہ پھر سے جوان ہو گیا ہے تو اس کے پھیرے کرتی ہے۔'' ''چپ بدتمیز!۔'' زرینہ چیخی اتنا سنتے ہی پنڈت جی نے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا اور اپنے ناپاک ہونٹ اس کے پھول سے رخساروں پر رکھ دیئے زرینہ نے انہیں دھکا دیا۔ پنڈت جی ڈھٹائی سے بولے۔ ''کچھ دنوں کی بات ہے میری جان! میرا جاپ بھی پورا ہونے والا ہے' جس کا جسم قصبے بھر میں تجھے پسند ہوگا۔ اسی جسم پر قبضہ کرلوں گا۔ ابھی سے میری ہو جا میری جان! فائدے میں رہے گی۔ روز ایک نیا جوان تجھے'' زرینہ بات کاٹ کر ایک بھپری ہوئی شیرنی کی طرح گرجی۔ ۔ ۔ ''ذلیل' کمینے' کتے' بڈھے خبیث' ملعون دور ہو جا میری نظروں سے ورنہ ابھی چیخ چیخ کر بستی بھر کر اکٹھا کرلوں گی پھر تیری چاند پر وہ جوت پڑے گا کہ عمر بھر یاد کرے گا۔'' پنڈت جی یہ سن کر آگ بگولہ ہو گئے اور بولے۔ ''اچھا تو پھر سنبھلنا میرے وار سے۔ تیرے باپ کو تو جہنم رسید کر ہی چکا ہوں تو بھی سہی۔'' یہ کہتے ہوئے پنڈت جی گڑھی کی طرف چلے گئے یہ سن کر زرینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اتفاق سے گلی اس وقت سنسان پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اپنے باپ کی موت کا سارا منظر گھوم گیا۔ زرینہ روتی ہوئی اپنی ماں کے پاس پہنچی اور اسے

پنڈت جی کی دھمکی سے آگاہ کیا۔اس کے بعد اپنی ماں کو ساتھ لیکر پھر پیر صاحب کی
خدمت میں حاضر ہوئی۔ پیر صاحب نے تمام ماجرا نہایت ٹھنڈے دل سے سنا اور
فرمایا ''فکر نہ کرو! شاید پنڈت جی کی اجل قریب آگئی ہے جو وہ اپنے شیطانی
وسوسوں کو پھر بروئے کار لانا چاہتے ہیں۔'' انہوں نے شریف علی کو آواز دی جو اس
وقت اندر زنانے میں گئے ہوئے تھے وہ آئے اور با ادب ہو کر بیٹھ گئے۔ پیر
صاحب نے انہیں سارا واقعہ سنایا پھر فرمایا'' ہمارا منشائے دلی یہ ہے کہ ہم زرینہ کی
نسبت تمہارے صاحبزادے شتاب علی سے کر دیں۔ تمہیں منظور ہے؟ اس لئے کہ
نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔ زرینہ بھی اب ماشاءاللہ بالغ ہوگئی ہے اور شتاب علی
بھی۔ جوڑا اچھا رہے گا'' ''میرے دادا شریف علی نے فوراً کہا۔'' جیسا حضور کا حکم
۔'' پیر صاحب نے فرمایا۔۔۔'' پھر نیک کام میں کیا دیری۔ کہاں ہے شتاب علی؟
۔'' اندر ہے بلاؤں؟'' شریف علی بولے۔

اسی وقت خود پیر صاحب نے میرے والد شتاب علی کا نکاح زرینہ سے
پڑھ دیا۔ جو دو چار لوگ اس وقت قصبے کے وہاں موجود تھے ان کو گواہ کیا۔ اس طرح
میری والدہ زرینہ کی شادی ہوگئی پیر صاحب نے اسی وقت فرمایا۔'' جاؤ زرینہ آج
سے تمہارا گھر یہ ہے اور کریمن تم بھی بڑھاپے میں کہاں ماری ماری پھرو گی۔ تم بھی
یہیں آجاؤ۔ زمین کا جو ماہانہ تمہیں ملے اپنے پاس رکھو۔ یہ خاصہ بڑا امکان ہے تمہیں
یہاں سکونت میں دقت نہ ہوگی۔ اور پھر کچھ دن بعد یہ کمرہ جس میں میں اس وقت
ہماری سکونت ہے خالی ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اب ہمیں مزید یہاں رہنے کا حکم

نہیں ہے۔'' یہ سن کر میری والدہ زرینہ تو اندر چلی گئیں ان کی والدہ کریمن وہیں
بیٹھی رہیں اور کچھ دیر بعد کہا۔۔'' یہ سب تو خیر آپ نے بہت کیا۔ مگر حضور وہ پنڈت
جی۔؟۔۔۔۔'' پیر صاحب نے بات کاٹ کر فرمایا۔'' انہیں جا کر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ
کیا کر رہے ہیں۔ وہ بڑے بے خبر ہیں کہ انہیں نہیں معلوم کہ یہ دن ان کی زندگی کا
آخری دن ہے اور وہ ابھی تک دنیا میں ملوث ہیں۔ وہ کل صبح نہیں دیکھ پائیں
گے۔'' ''یا مرشد! یہ آپ کے منہ سے کیا نکلا؟۔ شریف علی یعنی میرے دادا ایک دم
گھبرا کر بولے۔ پیر صاحب لب کشا ہوئے'' ہاں شریف علی! ہاں! یہ دنیا فانی ہے
کوئی اس میں قیامت تک نہیں جیئے گا۔ نہ تم نہ میں نہ پنڈت جی! آئی کوئی نہیں ٹال
سکتا ہم نے تو صرف کلمہ حق کہا ہے۔'' ابھی پیر صاحب نے یہ فقیرہ ادا ہی کیا تھا کہ
گھر کے اندر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں شریف علی بھاگ کر اندر گئے تو
معلوم ہوا کہ زرینہ منہ سے خون ڈال رہی ہے انہوں نے جلدی سے آکر یہ اطلاع
پیر صاحب کو دی۔ پیر صاحب نے فوراً ایک کٹورا پانی دم کر کے کریمن کو دیا کہ
'' جا کر زرینہ کو پلاؤ۔'' اور پھر نہایت اطمینان سے بولے۔ اس مرتبہ پنڈت جی کا
وار خالی جائیگا اللہ کی رحمت سے ہم یہاں موجود ہیں''۔

پیر صاحب یہ کہہ کر اور شریف علی کو ساتھ لیکر گڑھی کی طرف روانہ ہو گئے
گڑھی پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ پنڈت جی کچے کنوئیں کے پاس بیٹھے منتر جاپ کر
رہے ہیں۔ پیر صاحب نے جاتے ہی ایک کنکری کچھ پڑھ کر پنڈت جی کی طرف
ماری کنکری کا حصار میں گرتا تھا کہ ایک دھماکا سا ہوا اور پنڈت جی اچھل کر کچے

کنویں میں گر پڑے۔ جلدی سے شریف علی دوڑے اور کنویں میں رسی ڈال کر
انہیں نکالا پنڈت جی کو اس وقت دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے ان کے
بدن کا سارا خون نچوڑ لیا ہے۔ بمشکل انہیں اندر کمرے میں لے جایا گیا انہیں اندر
چارپائی پر شریف علی نے لٹایا۔ انہیں اس وقت کچھ غفلت سی تھی۔ کچھ ہوش میں تھے
۔اور کچھ بے ہوش۔ اسی عالم میں پیر صاحب نے ان سے فرمایا۔ ''پنڈت جی یاد
تمہارا آخری وقت ہے اپنے گناہوں سے توبہ کرلو'' پنڈت جی نے آنکھیں کھولیں
اور پوری قوت جمع کر کے بولے'' پیر صاحب اگر واقعی یہ میرا آخری وقت ہے تو
جان لو کہ تم نے بڑا پاپ کیا۔ میں آج کل درگامائی کے منتر کا جاپ کر رہا تھا اور پیر
صاحب! تمہارا بھی کیا قصور۔ جب اپنی ہی اولاد باغی ہو گئی۔ سن! اگر پیر صاحب
صحیح کہہ رہے ہیں کہ یہ میرا آخری سمے ہے اور میں مرنے والا ہوں تو تیرے لڑکے
شتاب علی کے زرینہ سے ایک لڑکا ہوگا جو میرے اس جاپ کو پورا کرے گا اور سن
! وہ لڑکا میرے دھرم پر لوٹ آئے گا اور آخری بات سن کہ مجھے نہ تیرا یہ پیر مار سکتا
ہے۔ نہ کوئی اور میں درگامائی کا چیلا ہوں۔'' اور یہ کہہ کر پنڈت جی ایک لمبی سانس
کھینچی جو واپس نہیں آئی اور ان کا جسم چارپائی پر اکڑ گیا پیر صاحب نے فرمایا
۔''اس مرتبہ پھر پنڈت جی نے حبس دم کرلیا ہے مگر اب انہیں کوئی واپس نہیں لاسکتا
اس لئے کہ انہوں نے حبس دم سے پہلے یہ نہیں سوچا کہ اب ان کے جسم میں اتنی
جان باقی نہیں رہ گئی...... کہ حبس دم کو سہار سکیں'' شریف علی! خدا تمہیں صبر دے

ایک آخری ہچکی لیکر ٹھنڈے ہو گئے۔

پنڈت کا کریا کرم ہندوؤں کے رسم و رواج کے مطابق کیا گیا۔ ان کی
ارتھی میں بہت کم لوگ شریک ہوئے لیکن پیر صاحب چونڈیرے شریف' شریف
علی کے ساتھ مرگھٹ تک ضرور گئے اور وہاں سے واپس آکر انہوں نے میرے
والد شتاب علی اور میری والدہ زرینہ کو بلا کر دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے
دادا شریف علی سے فرمایا'' اچھا شریف! اب ہم چلتے ہیں۔ خدا حافظ!۔'' اور یہ
کہتے ہی غائب ہو گئے۔ اس کے بعد اب میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں گا کہ مجھ پر کیا
گزری اور میں نے کس طرح اور کیوں درگامائی کے منتر کا جاپ کیا کس طرح میں
نے کامیابی حاصل کی۔ میں جو تمہیں مرلی دھر نظر آرہا ہوں۔ ایک کوڑھی۔ کس طرح
اپنے جسم کو چھوڑ کر مرلی دھر کوڑھی کے جسم تک آیا میری کہانی بڑی دردانگیز اور عبرت
ناک ہے کنور!۔ بہت۔ اور اتنی ہی پراسرار اور حیرت انگیز بھی میں آج سوچتا ہوں
تو مجھے سب خواب سا لگتا ہے کہ میں کس طرح درگامائی کا چیلا بن گیا۔ اور کس لئے
؟۔ کیا واقعی یہ میرے پردادا پنڈت گنگا پرشاد کی بددعا کا نتیجہ تھا؟۔ یا میری اپنی
غلط کاریاں۔ میں سوچتا ہوں تو دماغ کی نسیں پھٹنے لگتی ہیں مگر میں تمہیں اپنی کہانی
ضرور سناؤں گا۔ ضرور......!



بھائی علی حسن تمہیں کھانا پسند آیا میں نے آج خاص طور پر تمہارے لئے ..... ''اس نے فوراً میری بات کاٹ کر کہا۔

''کیا کہا ' پھر کہو ایک دفعہ علی حسن ..... علی حسن .....! میں نے نے آج کتنے دن بعد اپنا نام سنا ہے اپنا نام سننے کو میرے کان ترس گئے کنور شاید تم اس مسرت کا اندازہ نہیں کر سکتے ..... نہ جانے کتنے سال بیت گئے مجھے اپنا نام سنے ہوئے۔ اپنے نام میں ایک اور ہی نشہ ہوتا ہے۔ اپنے نام کی پیاس کا اندازہ جتنا مجھے ہے شاید ہی کسی کو ہو' میں نے نہ جانے اب تک کتنے نام برتے۔ مجھے ان کی گنتی بھی یاد نہیں ..... کتنے جسم میں نے پہنے' کتنے اتار دیئے ....ہاں' ہاں ..... میری طرف حیرت سے مت دیکھو ..... جسم میرے لئے بالکل کپڑوں کی طرح تھے ..... بالکل کپڑوں کی طرح ..... جب ایک جسم سے جی بھر جاتا اسے اتار پھینکتا اور دوسرا جسم پہن لیتا۔ یہ بات اس وقت تمہیں ضرور عجیب سی لگے گی۔ مگر جب تم میری پوری سرگزشت سن لو گے تمہیں میرے اس بیان کی صداقت پر یقین

آ جائے گا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اپنا جسم اور اپنا نام کھو جانا کتنی بڑی محرومی ہے
اسے کچھ میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ آؤ ادھر آؤ! میرے قریب آ جاؤ۔ میں تمہیں حسب
وعدہ اپنی سرگزشت سناؤں گا۔ یہ کہہ کر اس نے درخت کے تنے سے ٹیک لگائی اور
آنکھیں بند کر لیں نہ معلوم وہ اپنے ماضی کی کن دنیاؤں کی سیر کر رہا تھا.... اس نے
کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔

''جیسا کہ شاید میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ جب میرے دادا شریف علی
پیر چونڈیرے شریف کے ہاتھ پر بیعت کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اس
وقت وہ شادی شدہ تھے اور ایک بچے کے باپ بھی بن چکے تھے۔ اس وقت میرے
والد شتاب علی کی عمر تقریباً دس گیارہ سال تھی میرے دادا کے مسلمان ہوتے ہی
میری دادی نے بھی پیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور میرے والد شتاب علی کو بھی
میرے دادا نے پیر صاحب کے ہاتھ پر دس گیارہ سال ہی کی عمر میں بیعت کرا
دی۔

میرے والد شتاب علی کا بچپن میں میرے دادا شریف علی نے بنواری لال
رکھا تھا' اب پیر صاحب نے ان کا نام بھی بدل کر شتاب علی رکھ دیا تھا' مگر جیسا کہ
ظاہر ہے دس گیارہ سال کی عمر میں بچہ خاصہ ہوش سنبھال لیتا ہے۔ میرے والد کے
بہت سے ہندو دوست تھے۔ کیونکہ ان کا تعلق ایک پنڈت گھرانے سے تھے اس
لئے مذہبی امور کی تعلیم انہیں شروع ہی سے دی گئی تھی۔ وہ دس سال کی عمر ہی میں
گیتا اور رامائن کا پاٹ کر لیا کرتے تھے اور بڑی سریلی آواز میں جب بھی قصبے میں

کتھا وغیرہ ہوتی تھی گیتا اور رامائن کا پاٹ کر کے لوگوں کو مبہوت کر دیتے تھے جیسا
کہ تمہارے علم میں ہے ان کی شادی تقریباً 15 یا 16 سال ہی کی عمر میں میری
والدہ زرینہ کے ساتھ کر دی گئی تھی۔ میرے دادا اور دادی یہ واحد اولاد تھے اس
لئے دونوں ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ جب میرے دادا اور دادی مسلمان
ہوئے اور میرے پردادا پنڈت گنگا پرشاد نے انہیں اپنی گڑھی سے نکال دیا اور وہ
قصبے کے اس حصے میں منتقل ہو گئے۔ جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی' اس وقت
میرے والد شتاب علی خاصے رنجیدہ اور کبیدہ خاطر ہوئے۔ اس لئے کہ وہ اپنے
دادا پنڈت گنگا پرشاد کے بڑے چہیتے تھے۔ گڑھی سے نکالے جانے کے بعد شریف
علی نے میرے والد پر پابندی عائد کر دی تھی کہ وہ پنڈت گنگا پرشاد سے اب نہیں
ملیں گے۔ اس بات سے شتاب علی کو خاصی تکلیف ہوئی تھی۔ مگر اپنی والدہ کے
سمجھانے بجھانے اور لاڈ پیار کی وجہ سے انہوں نے اپنے دادا کے پاس آنا جانا
بالکل ترک کر دیا۔ لیکن انہوں نے اپنے ہندو دوستوں سے ملنا جلنا ترک نہ کیا اور
اب بھی قصبے میں کوئی ہندو تیوہار آتا وہ اس میں ضرور بضد ہو کر شرکت کرتے۔

ہولی ہوتی تو شتاب علی خوب پچکاریاں بھر بھر کے تمام قصبے میں اپنے ہندو
دوستوں کے ساتھ ہولی کھیلتے پھرتے' دیوالی آتی تو وہ اپنے والد شریف علی کے لاکھ
منع کرنے پر بھی تمام گھر کو چھوٹے چھوٹے دیوں سے روشن کر دیتے شریف علی
پھونک مار مار کر انہیں بجھاتے اور وہ انہیں روشن کرتے جاتے۔ شریف علی جھنجلا کر
انہیں مارنے دوڑتے اور سمجھاتے کہ۔'' دیکھو اب ہم مسلمان ہو چکے ہیں۔ ہمیں

سب کفر نہیں کرنا چاہیے۔'' مگر شتاب علی نہ مانتے جب شریف علی کے سمجھانے کا
ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تو میری دادی' والد کو الگ لے جا کر سمجھاتیں اور ان کے
سمجھانے پر میرے والد شتاب علی روتے جاتے اور ایک ایک دیا خود اپنی پھونکوں
سے بجھاتے جاتے۔

رام لیلا ہوتی تو شریف علی سوانگ میں حصہ لیتے کبھی لچھمن بنتے' کبھی رام
اور رام لیلا کے میلے میں اپنے تمام ہندو دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ شریک
ہوتے۔ میری دادی کسی طرح سمجھا بجھا کر میرے دادا شریف علی کا غصہ ٹھنڈا کرتیں
اور کہتیں کہ'' کیا ہوا بچہ ہے سمجھ جائے گا اور یہ تو دیکھو کہ تمہارے کہنے پر کتنا چلتا ہے
کبھی ایک وقت کی نماز قضا نہیں کرتا۔ قرآن شریف بھی جی لگا کر پڑھتا ہے' اگر وہ
سال بھر میں دو ایک دفعہ یہ اودھم مچا لیتا ہے تو کون سی آفت آ گئی'' شریف علی یہ سن
کر ٹھنڈے پڑ جاتے۔

ایسا نہیں تھا کہ شتاب علی اسلام سے متنفر تھے بلکہ وہ مزاجاً کچھ اس طرح
کے واقع ہوئے تھے کہ انہیں میلوں' ٹھیلوں' تہواروں اور جہاں بھی سارے قصبے کی
اجتماعی زندگی کا معاملہ ہوتا تو وہ اس میں پیش پیش رہتے' جس طرح وہ ہندوؤں کے
میلوں' تہواروں' وغیرہ میں دلچسپی لیتے تھے' اسی طرح عید' شب برات اور
مسلمانوں کے دوسرے تہواروں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ شتاب علی عید پر
اپنے تمام ہندو دوستوں کو بھی اپنے گھر بلاتے۔ بغیر ہندو مسلمان کی تخصیص کے
سب سے گلے ملتے پھرتے۔

شتاب علی قصبے کی عام زندگی کی علامت تھے...... دراصل قصبے کی فضاء
یہی تھی کہ ہندو مسلمانوں کے تہواروں پر چھٹی کرتے اپنے کام کاج چھوڑ کر
مسلمانوں کی خوشی میں شامل ہوتے اور مسلمان ہندوؤں کے تہواروں پر ان کے
ساتھ خوب رنگ رلیاں مناتے لیکن جب سے شریف علی' مولوی فضل داد مرحوم اور
قصبے کے بہت سے ہندو اور مسلمانوں نے پیر صاحب چونڈ یرے شریف کے ہاتھ
پر بیعت کی تھی اور کچھ ہندو دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ ہندو اور مسلمانوں
کے درمیان کچھ کشیدگی سے پیدا ہو گئی تھی لیکن یہ کشیدگی کی فضا صرف کچھ گھرانوں
تک محدود تھی یہ عام فضا نہیں تھی یہ کشیدگی جن گھرانوں میں تھی ان میں خاص طور پر
وہ ہندو گھرانے شامل تھے جو پیر صاحب چونڈ یرے شریف کے ہاتھ پر بیعت کر
کے مسلمان ہو چکے تھے انہیں میں ایک گھر پنڈت گنگا پرشاد کے لڑکے یعنی میرے
دادا شریف علی کا تھا' شریف علی جنہوں نے مسلمان ہونے کے بعد مسلمانوں سے
اپنے تمام تعلقات منقطع کر لئے تھے اور ان کے تہواروں پر ان کے ساتھ شریک ہونا
چھوڑ دیا تھا شاید ایک مرتبہ جمعے کے دن ہولی پڑی۔ شریف علی قصبے کی بڑی مسجد
میں نماز جمعہ ادا کرنے جا رہے تھے کہ ان کے ایک ہندو دوست گھنشیام نے ان کے
صاف شفاف کپڑوں پر ایک رنگ کی پچکاری ماری گھنشیام' شریف علی کے بچپن کا
لنگوٹیا یار تھا شریف علی اس بات پر گھنشیام سے اتنے برہم ہوئے کہ ایک بڑا جھگڑا
ہوتے ہوتے رہ گیا۔ شریف علی نے گھنشیام سے ہمیشہ کے لئے تعلقات منقطع کر
لئے۔ گھنشیام کا خیال تھا کہ شریف علی لاکھ مسلمان ہو گئے ہیں مگر اس کی دوستی کا

خیال ضرور کریں گے اور حسب معمول اس کے پیچھے بھاگیں گے اور اسے رنگ
گلال میں نہلا دیں گے مگر یہ شریف علی تھے۔ گھنشیام کی دوستی پیارے لال سے
وہ پیارے لال جو کبھی کا مر چکا تھا۔ شریف علی نے اپنے اندر کے پیارے لال کا
گھونٹ دیا تھا اس لئے ان کے ساتھ وابستہ تمام یادیں اور محبتیں بھی ان کے لئے
مر چکی تھیں۔ ردعمل ظاہر ہے شریف علی کی اس برہمی پر گھنشیام رو پڑا اور اس نے
وقت اپنی پچکاری کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اس ہولی پر پھر کسی نے اسے گھر
نکلتے نہ دیکھا۔

قصبے میں اس نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا' اس سے پہلے کسی مسلمان
اس شدید ردعمل کا کبھی اظہار نہیں کیا تھا' اس واقعے کو رفتہ رفتہ لوگوں نے بھلا
۔ مگر اس کا ہلکا سا ایک نقش سا ان کے دلوں پر ضرور رہ گیا اور آئندہ ہولی کے تہوار
انہوں نے تھوڑی احتیاط برتی تا کہ کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ نہ ہونے پائے جس
لوگوں کے دلوں میں رنجش پیدا ہو مگر میرے والد شتاب علی اس کشیدگی کی فضاء
الگ تھے۔ وہ حسب معمول ہولی ہو کہ دیوالی' دسہرا ہو کہ رام لیلا' برابر ہندوؤں
ساتھ عام مسلمانوں کی طرح شرکت کرتے اور نہ صرف شرکت کرتے بلکہ بڑ
چڑھ کر حصہ لیتے۔ کیونکہ وہ خود پنڈت گھرانے کے فرد تھے اس لئے ہندوؤں
رسم و رواج اور تہذیب و تربیت سے زیادہ واقف تھے ہندو اور مسلمان دونوں
میرے والد شتاب علی سے خوش تھے اگر ناخوش تھے تو صرف شریف علی۔ لیکن کچ
بیٹے کی محبت اور کچھ میری دادی کے سمجھانے بجھانے کے سبب وہ اب برملا اس خ

کا اظہار نہیں کرتے تھے اور دل ہی دل میں میرے والد کی حرکتوں پر کڑھتے تھے۔
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شروع ہی سے میرے والد ایک دوہری شخصیت کے عادی
ہو گئے۔ ان کی ایک اور دلچسپی تھی وہ یہ کہ مسلمان ہونے کے باوجود سادھوسنتوں اور
رِشی مہاتما قسم کے لوگوں کو بہت پسند کرتے تھے اور نہ صرف پسند کرتے تھے بلکہ ان
کی صحبت میں بیٹھنے کے مواقع بھی تلاش کرتے رہتے تھے۔ جب بھی قصبے میں اس
طرح کا کوئی سادھو قسم کا شخص جوگیا لباس پہنچے دکھائی دیتا سب سے پہلے اس کی آؤ
بھگت کرنے والوں میں میرے والد بھی ہوا کرتے تھے میں نے اپنے والد کے
حالات اتنی تفصیل سے اس لئے بتائے کہ تمہیں اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ میں
نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ اپنے اندر اور باہر کس طرح کا تھا۔

جب میرے والد شتاب علی کی شادی ہوئی تو جیسا کہ تمہارے علم میں ہے
اس کے کچھ دیر ہی بعد میرے پردادا پنڈت گنگا پرشاد اس دنیا سے چل بسے اور
مرنے سے پہلے انہوں نے جو پیش گوئی کی اس سے میرے والد کو اس وقت آگاہ
نہیں کیا گیا تا کہ وہ کسی وہم یا خوف کا شکار نہ ہوں لیکن ابھی پنڈت گنگا پرشاد کو
مرے ہوئے چھ مہینے ہی ہوئے ہونگے کہ میرے دادا شریف علی پر شدید فالج کا
حملہ ہوا۔ فالج کا حملہ بائیں طرف تھا۔ وہ مشکل سے دو دن زندہ رہ سکے مرنے سے
پہلے انہوں نے بمشکل اٹک اٹک کر میرے والد کو پنڈت گنگا پرشاد کی پیشگوئی سے
آگاہ کیا' اس لئے کہ فالج کے اثر سے ان کی زبان بار بار لڑکھڑاتی تھی۔

شریف علی نے میرے والد کو بتایا۔

''سنو! شتاب علی، تمہارے دادا پنڈت گنگا پرشاد نے اپنے مرنے
پہلے ایک پیش گوئی کی تھی تمہارے بارے میں، میرا آخری وقت ہے اس لئے
تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں جو تمہارے دادا نے کہا ہے۔ غور سے سنو! انہ
نے پیشگوئی کی ہے کہ جس طرح تم میری واحد اولاد ہو اسی طرح تمہارے
صرف ایک لڑکا ہوگا لیکن وہ لڑکا پھران کے دھرم پر واپس آ جائے گا۔ یعنی تمہار
واحد لڑکا ہندو مذہب دوبارہ قبول کرلے گا اور اس کے علاوہ یہ کہ وہ اس جاپ کو
پورا کرے گا۔ جس کو پنڈت جی اپنی زندگی میں پورا نہیں کر سکے یعنی تمہارا
درگامائی کا چیلا ہو جائے گا اور وہ درگامائی کے منتر کے جاپ کو پورا کر کے دکھا
جس کی رو سے وہ جس کے جسم میں چاہے آ جا سکے گا اور جس کے جسم پر چاہے قبـ
کرلے گا اب میں تمہیں اپنے مرنے سے پہلے یہ وصیت کرتا ہوں کہ اگر خدانخوا
ایسا ہی ہو کہ زرینہ سے تمہارے یہاں صرف ایک لڑکا ہی پیدا ہو تو تم اس کی بہ
دیکھ بھال کرنا اور شروع ہی سے اس کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھنا۔ اس کی تر
عین اسلامی ہونی چاہئے تاکہ وہ بڑا ہو کر بہک نہ سکے۔ تم اس بات کا وہم نہ کرنا
نے احتیاط کے طور پر تم سے یہ بات کہی ہے۔ خدا نہ کرے ایسا ہو کہ میرا پوتا ہندو
جائے اور درگامائی کا چیلا کہلائے۔''

اسی شام میرے دادا شریف علی کا انتقال ہو گیا، میرے والد کو ان
موت کا بے حد رنج ہوا۔ اور اس سے بھی زیادہ میری دادی کو ان کا دکھ ہوا۔ وہ ا
دکھ کو تین مہینے سے زیادہ برداشت نہ کرسکیں اور اللہ کو پیاری ہو گئیں انہوں نے

اپنے مرنے سے پہلے میرے والد کو میرے دادا کی وصیت کا خیال دلایا اور تاکید کی
کہ میرے والد اپنے بیٹے کو شروع ہی سے اسلامی تعلیم کا نمونہ بنائیں اور ہندو
تہذیب کو اس کے پاس بھی نہ پھٹکنے دیں۔

اس سارے خوف کی وجہ پنڈت گنگا پرشاد کی پیشگوئی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے
کہ کیا ہونا تھا جیسا کہ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ میرا بچپن بہت سخت گزرا، مجھ پر
ہر طرح پہرے تھے مجھے بچپن ہی روزے نماز کا پابند کیا گیا لیکن تقدیر تو کچھ اور ہی
گل کھلا رہی تھی جیسا کہ میں نے تم سے ابھی کہا تھا کہ میرے والد ایک دوہری
شخصیت کے مالک تھے یعنی وہ پکے مسلمان ہونے کے علاوہ ہندو رسم و رواج میں
بھی دلچسپی لیتے تھے۔ کوئی تہوار آتا وہ تمام قصبے کے گھروں کے علاوہ میرے گھر بھی
آتا اور اب تو والد کو اپنی آزاد خیالی کی کھلی چھٹی تھی اس لئے کہ اب ان کے والد
شریف علی تو انتقال کر ہی گئے تھے جو ان کی آزاد خیالی پر ناراض ہوتے لیکن میرے
والد شتاب علی کو ڈر تھا تو صرف میرا۔

میرے ہوش میں جو پہلی ہولی پڑی، میں نے دیکھا کہ والد بھوت بنے
ہوئے گھر میں داخل ہو رہے ہیں اور ان کے ہاتھ میں رنگ پھینکنے کی پچکاری ہے۔
آتے ہی انہوں نے ایک رنگ کی پچکاری میری والدہ زرینہ پر ماری جو اس وقت
ور رنگ گھولنے میں مشغول تھیں میں اس وقت والدہ کے قریب بیٹھا سپارہ کھولے
مولوی صاحب کا دیا ہوا سبق یاد کر رہا تھا تھوڑا سا رنگ میرے سپارے پر بھی آ کر
گرا۔ مگر جب میں نے دیکھا کسی نے اس بات کی طرف توجہ نہیں کی تو والدہ کو اس

حالت میں دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانے لگا والدہ نے بھی جواب میں میرے وا
پر رنگ پھینکا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر والدہ کے گھولے ہوئے رنگ میں پا
رکھا ہوا ڈونگا ڈبویا اور بھاگ کر جلدی سے والدہ کی پیٹھ پر ڈال دیا۔ انہوں
مجھے ایسا کرتے دیکھا تو ایک دم پکڑ کر ایک ہاتھ جڑ دیا اور بہت گھڑ کا اور کہا کہ می
آئندہ کسی پر رنگ نہ ڈالوں میں رونے لگا اور رو کر گھر سے باہر جانے کے ل
پر تول ہی رہا تھا کہ والدہ نے مجھے گھسیٹ لیا۔

''تو آج کے دن باہر نہیں نکل سکتا'' باہر ہولی شباب پر تھی۔ میں نے ذ
ہوش سنبھالا تو اس بات کو سنجیدگی سے محسوس کیا کہ مجھے دانستہ ان تقریبات سے د
رکھا جاتا ہے۔

اپنے والدین کے اس روّیے سے مجھے سخت کڑھن اور پریشانی ہونے لگی
ور ایک عجیب گھٹن کا سا احساس میرے اندر پرورش پانے لگا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیس
میں ایک عجیب قید میں ہوں رفتہ رفتہ مجھے اس قید و بند سے نفرت ہونے لگی، جس
قدر مجھے ان پابندیوں سے نفرت پیدا ہوتی گئی اور کسی حد تک میں اس کا اظہار بھ
کرنے لگا، اسی قدر میرے اوپر سختی برتی جانے لگی..... اس سے مزاج میں ایک قس
کی جھنجلاہٹ پیدا ہوگئی پھر یہ کہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوتا، دیوا
ہوتی تو خوب گھر سجایا جاتا۔ روشنی ہوتی، رام لیلا ہوتی تو میرے والد اس میں خوب
حصہ لیتے مگر مجھے ان میں سے کسی بھی تقریب میں شامل ہونے کی اجازت نہیں
تھی۔ سوائے مسلمانوں کے تہواروں کے اور وہ بھی صرف گھر ہی گھر میں، اس ـ

یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ میری نفرت کا رخ اپنے والدین کی طرف مڑ گیا۔ اب میں
مجبوراً ہی ان کا کہنا مانتا تھا وہ اور بھی میرے اوپر سختی کرتے تھے اگر ایک وقت بھی
نماز قضا ہو جاتی تو والد مار مار کر مجھے سجا دیتے۔ والدہ الگ لعنت ملامت کرتیں اور
بوڑھی نانی اماں کریمن بھی سوائے نصیحتیں کرنے اور مجھ سے اپنی کمر دبوانے کے
کچھ نہ کرتیں، ان سب کے علاوہ یہ کہ جب بھی قصبے میں کوئی سادھو یا جوگی آتا، وہ
ہمارے ہی گھر ٹھہرتا لیکن مجھے اس سے ملنے اس کے پاس آنے جانے کی قطعی
اجازت نہ ہوتی۔

اب میری عمر تقریباً **15** سال ہو چکی تھی، ایک دن میں اپنی والدہ سے
اپنے اوپر عائد کردہ پابندیوں پر احتجاج کر رہا تھا کہ میرے والد شتاب علی آ گئے اور
میری گفتگو کا ایک حصہ انہوں نے بھی سن لیا، انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور
سمجھایا کہ اصل بات کیا ہے جس کے سبب مجھ پر اتنی نگرانی ہے مجھے انہوں نے
پنڈت گنگا پرشاد سے لے کر اپنے والد شریف علی اور اپنے تمام حالات سے آگاہ کیا
مگر اس وقت تک میرے دل میں ان کی نفرت جڑ پکڑ چکی تھی ان کی ایک بات کا
بھی اثر میرے دل پر نہ ہوا انہوں نے سمجھا کہ شاید اب میں سدھر جاؤں گا، مگر
جب انہوں نے دیکھا کہ اب میں کئی کئی وقت کی نماز قضا کرنے لگا ہوں تو ایک دن
پکڑ کر میری خوب مرمت کی، اس کا بھی مجھ پر الٹا اثر ہوا پہلے میں ان کے خوف سے
نماز قضا نہ کیا کرتا اب نماز نہ پڑھنے کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔ کبھی کہتا کپڑے
گندے ہیں۔ کبھی کہتا کپڑوں پر چھینٹیں آ گئی ہیں۔ بہرحال اسی طرح وقت گزرتا

رہا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری نفرت اور بڑھتی رہی۔

اس عرصے میں یہ ہوا کہ ہمارے قصبے میں ایک سادھو مہاراج آگئے اور حسب معمول میرے والد شتاب علی انہیں اپنے یہاں لے آئے۔ اتفاق سے جب میرے والد ان کی جھولی اور کمنڈل اٹھا کر ان کے ساتھ گھر میں داخل ہو رہے تھے' میں گھر سے نکل رہا تھا۔ سادھو مہاراج نے ایک نظر مجھے دیکھا ان کی نظر میں عجیب کشش سی تھی۔ ان کا حلیہ بھی عجیب تھا' گیروا کپڑے' ننگے پاؤں' ننگے سر' سر کے بال اور داڑھی کے بال بے انتہا بڑھے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں گورا رنگ...... بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ان کا نام سوامی اوم پرکاش جی تھا۔ لوگ انہیں صرف سوامی جی کہتے تھے۔ سوامی جی نے مجھے دروازے سے نکلتے دیکھا تو روکا اور کہا۔

''بچہ! کدھر جاتا ہے' میری آشیرباد نہیں لے گا؟'' اور میں کھنچا سا ان کے قریب پہنچ گیا۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور آشیرواد دی۔ پھر کہا۔

''بھگوان تجھے سکون سے رکھے۔ بہت جلد تیرے دن پھرنے والے ہیں'' یہ سن کر میرے والد نے جلدی سے کہا۔

''چلیئے مہارج' اندر چلیئے' یہ تو بس ایسے ہی پاگل ہے'' پھر مجھ سے بولے۔

''چل جا اپنا کام کر' عصر کی اذان ہو چکی ہے' جلدی سے جا کے نماز پڑھ' ورنہ جماعت نہیں ملے گی''۔

میرے جی میں یہ سن کر آیا کہ کہدوں آپ جو یہاں نماز قضا کر رہے ہیں ...... یہ کیوں؟ مگر میں خاموشی سے گھر کے باہر نکل گیا اور مسجد کی طرف چل دیا۔ راستے میں مجھے سوامی جی کا خیال آیا۔ جب انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا ۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے میرا سارا ذہنی بوجھ ہلکا کر دیا ہو۔ ایک دم میں ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔

اس کے دوسرے دن ایک عجیب واقعہ ہوا' ہوا یوں کہ میں فجر کی نماز پڑھ کر آ رہا تھا اور سوامی جی شاید مندر سے پوجا کر کے لوٹ رہے تھے کہ ان کے سامنے ایک ہندو شخص (جس کا نام دھرم پال تھے جسے میں اچھی طرح جانتا تھا) آیا اور ان کے چرن چھو کر ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا' اس وقت سوامی جی ایک پیڑ کے قریب تھے۔ وہیں رک گئے۔ دھرم پال نے کہا۔

''مہاراج میرے اوپر کرپا کیجئے۔ میری ایک کنیّا ہے جس کا مجھے اسی بیساکھ میں وواہ کرنا ہے۔ پر پلے کچھ نہیں' دان ہیج کہاں سے لاؤں گا' مہاراج کی کرپا درشٹی ہو جائے تو بیڑا پار لگ جائے'' یہ کہہ کر دھرم پال رونے لگا اور سوامی جی کے قدموں پر گر گیا۔

سوامی جی نے کہا۔ ''اٹھ دھرم پال اٹھ! بھگوان تیری سہائتا کریں' جا اور اس سامنے والے پیڑ کو خوب زور سے ہلا جو پھول پتے گریں انہیں اپنی گودی میں بھر کے ہمارے سامنے لا'' دھرم پال نے ایسا ہی کیا درخت کے قریب گیا پیڑ ابھی چھوٹا سا ہی تھا۔ دھرم پال نے اسے پوری قوت سے ہلایا' بہت سے پھول پتے

گرے۔ جنہیں دھرم پال اپنی قمیض کے دامن میں سمیٹتا رہا اور جب وہ ایک ایک پھول اور پتا سمیٹ چکا تو سوامی جی کے پاس آیا سوامی جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے آشیر واد دی اور کہا۔

''جا بھگوان نے تیری سن لی''۔ مگر سن! دان پن سے کبھی جی نہ چرانا دیکھ تیری جھولی میں کیا ہے؟۔

اب جو دھرم پال نے اپنی گود پھیلا کر دیکھا تو دنگ رہ گیا' میں بھی حیرت سے ان کے پیچھے ذرا دور کھڑا ہوا یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا۔ دھرم پال کی گو جواہرات سے بھری ہوئی تھی وہ پھر سوامی جی کے قدموں میں گر گیا' آخر کار سوا جی نے اسے اپنے قدموں سے اٹھایا اور کہا۔

''جا اپنی کنیا کے ہاتھ پیلے کر' بھگوان تجھ پر اپنی کرپا کرے۔ یہ کہہ کر سوامی جی میرے گھر کی طرف چل دیئے اور میں ان کے پیچھے پیچھے......

میں نے اس وقت جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اتنا عجیب او حیرتناک تھا کہ اگر میں کسی اور سے یہ واقعہ سنتا تو کبھی یقین نہ کرتا' میں دل ہی دل میں سوامی جی کا قائل ہو گیا میں دبے دبے قدموں سے سوامی جی سے کچھ فاصلے پ ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سوامی جی نے مجھے نہیں دیکھا مگر کچھ قدم ہی چل کر سوامی جی رکے' اس وقت گلی میں کوئی نہیں تھا۔ سوامی جی نے بغیر مڑے کہا۔

''علی حسن' ہمارے سامنے آ جاؤ! ادھر ہمارے پاس آ کر آشیر واد لو' ہمیں

تم سے کچھ کہنا بھی ہے''۔

میں تو اپنے دل میں ان کا قائل ہی ہو چکا تھا.... بڑی عقیدت کے ساتھ آگے بڑھا اور ان کے سامنے آ گیا۔ میں نے دھرم پال ہی کی طرح سوامی جی کے چرن چھوئے اس عمل سے میرے دل کو ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ سوامی جی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے آشیر واد دی اور کہا۔

''بھگوان نے ہمیں یہاں تمہارے ہی کارن بھیجا ہے ورنہ ہم تو کنچنگا کی چوٹی پر بیٹھے رام نام جپ رہے تھے کہ ہمیں درگا مائی نے درشن دیئے اور ہم سے کہا۔

''سنو! اوم پرکاش' ہم تمہیں آج اپنا ایک کاریہ سونپتے ہیں' ہمارے ایک چیلے کی آتما دیاکل ہے' وہ اس سمے دھرم پور میں ہے۔ تم اسے یہاں لے کر آؤ تاکہ وہ یہاں بیٹھ کر ہم سے دھیان لگائے اور ہمارے منتر کا جاپ کر سکے وہ پنڈت گنگا پرشاد کی اولاد میں ہے اور اس کا نام علی حسن ہے۔ ہم تمہیں اتنی شکتی پراپت کر دیتے ہیں کہ تم آنکھ میچتے ہی پہنچ جاؤ گے''۔

سو ہم نے ایسا ہی کیا۔ درگا مائی کی بات ہم کیسے ٹال سکتے تھے۔ ہم نے یہاں آ کر دیکھا کہ سچ مچ تم بڑے ویاکل ہو ادھر درگا مائی تمہارے لئے ویاکل ہیں ...... اس سے ہمیں اس کا موقع مل گیا کہ دو گھڑی تم سے اپنے من کی بات کر لیں' کل پورن ماشی ہے کل رات 12 بجے مرگھٹ میں آ جاؤ.... تمہارے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ ہمارا سارا جیون بیت گیا پرنتو درگا مائی نے ہمیں کبھی اپنے درشن

نہ دیئے اور نہ ہمیں اپنا چیلا بنانا سویکار کیا۔ تم بھاگیوان ہو کہ درگامائی نے تمہیں سویکار کیا...... بولو تم راضی ہو؟'' یہ کہہ کر سوامی جی نے میری طرف دیکھا۔

میں نے پوچھا۔ ''سوامی جی! کیا آپ بھی میرے ساتھ ہونگے؟''

اس پر سوامی جی نے کہا۔ ''اوشیہ بچہ! اوشیہ بچہ ورنہ تم اکیلے کنچنگا کی چوٹی تک کس طرح پہنچ سکتے ہو''۔

میں نے کہا۔ ''میں ضرور آپ کے ساتھ جاؤں گا..... ضرور ...... سوامی جی میرا جواب سن کر خوش ہوئے اور کہا۔

''ہم تمہارے اتر سے پرسن ہوئے..... دھنیہ ہو.... ہم نے ایک کاریہ پورا کیا۔ کل رات 12 بجے مرگھٹ میں پہنچنا...... بھولنا نہیں......''!

میں نے انہیں یقین دلایا۔ نہیں مہاراج! یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔'' یہ سن کر اوم پرکاش اوم.... اوم اور جے بجرنگ بلی کا نعرہ مارتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے گھر میں داخل ہوگئے اور ان کے کچھ دیر بعد میں اندر گھر میں چلا گیا۔

میں گھر میں داخل ہونے کے بعد حسب معمول قرآن کھول کر تلاوت کرنے لگا اور دل ہی دل میں خوش ہونے لگا کہ کل میں ان سب پابندیوں اور مجبوریوں سے آزاد ہو جاؤں گا بالکل آزاد..... جیسے تیسے میں نے وہ دن گزارا اور بے چینی سے رات کا انتظار کرنے لگا مجھے ایسا لگا کہ وقت بہت ہی آہستہ بے حد آہستہ گزر رہا ہے۔ میں نے عشاء کی نماز ادا کی اور گھر آ گیا نیند کوسوں پتا نہیں تھا

میں خود بھی سونا نہیں چاہتا تھا.... اسی طرح پڑا رہا اور چنگی کے گھنٹوں کی آواز گنتا رہا ..... نو دس، گیارہ..... میں نے کروٹ بدلی..... دیکھا کہ میرے والد بے خبر سو رہے ہیں اور والدہ بھی...... لالٹین کی لو بہت مدھم ہے، میرے گھر سے مرگھٹ کا راستہ بمشکل پندرہ منٹ کا تھا، مگر میں گیارہ بجتے ہی بستر چھوڑ کر بہت آہستہ سے اٹھ گیا۔ میں نے ایک نظر اپنی سوتی ہوئی والدہ پر ڈالی اور پھر والد کی طرف دیکھا۔ اور دبے دبے قدموں سے ننگے پیر ہی اٹھ کر چل دیا، تاکہ میرے جوتے پہننے سے کسی کی آنکھ نہ کھل جائے۔ میں صدر دروازے تک آیا۔ دیکھا کہ کنڈی کھلی پڑی ہے ایک لمحے کو مجھے کچھ خوف سا آیا اور میں نے صدر دروازے کے قریب بنے ہوئے کمرے میں کھڑکی سے جھانکا۔ اس کمرے میں بھی لالٹین روشن تھی مگر سوامی اوم پرکاش جی کا کہیں پتا نہ تھا۔ یہ دیکھ کر میری ہمت بندھی اور میں نے سوچا کہ شاید سوامی جی مرگھٹ جا چکے ہیں اور وہاں میرا انتظار کر رہے ہونگے اس لئے مجھے بھی چلنا چاہئے''۔

اس کے بعد میں گھر کے باہر گلی میں نکل آیا۔ میری ہلکی سی آہٹ ہی سے گلی کے کتے جاگ پڑے میں ڈر گیا۔ مگر جیسے ہی ان کے قریب پہنچا اور آہستہ سے انہیں پچکارا وہ خاموش ہوگئے۔ وہ مجھ سے کسی قدر مانوس تھے۔ میں اپنی گلی سے نکل کر دوسری گلی میں داخل ہوا اور تھوڑی ہی دیر میں گلیوں گلیوں قصبے کے قبرستان تک پہنچ گیا۔ میں نے خاص طور پر ایسی گلیوں کا انتخاب کیا جن میں مجھے کتے نظر نہ آئے، تاکہ کتے بھونکنے سے بستی والے جاگ نہ جائے۔ قبرستان کے قریب پہنچ

کر مجھ پر پھر ایک مرتبہ خوف ساطاری ہوا اور مجھے اپنی نانی کریمن یاد آنے لگیں
کے انتقال ابھی کچھ دن ہی ہوگیا تھا انہیں اسی قبرستان میں دفن کیا گیا تھا وہ بیچا
بھی مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں اور اکثر مجھے پٹنے سے بچاتی تھیں مگر میر وا
زرینہ کے ساتھ ساتھ وہ بھی ہر وقت مجھے نصیحتیں ہی کرتی تھیں اور روزے نماز
پابندی کے لئے تاکید کرتی رہتی تھیں اس لئے مجھے خوشی سی ہوئی کہ چلو اچھا ہوا
ایک نصیحت کرنے والا تو کم ہوا۔ میں نے ایک نظر قبرستان کی طرف دیکھا اور
ایک بار مجھے تھرتھری سے چڑھ گئی اتنی رات گئے تنہا..... ظاہر ہے کہ مجھے خوف
ہی چاہئے تھا میں نے آہستہ آہستہ آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دی اتنے میں
سے ایک گھنٹے کی آواز آئی اور میں سمجھ گیا کہ **(11/1/2)** ساڑھے گیارہ بج
۔ مرگھٹ قبرستان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے یہ راستہ بھی طے کی
'اس وقت مرگھٹ کو دیکھ کر مجھ پر ایک مرتبہ پھر ہیبت سی طاری ہوگئی۔ میں
زندگی میں پہلی مرتبہ مرگھٹ آرہا تھا' میں مرگھٹ کے دروازے تک پہنچا دروازہ
ہوا تھا........ میں جیسے ہی مرگھٹ میں گھسا مجھے سوامی جی کی آواز سنائی دی۔

''علی حسن .... تم آگئے ...... ڈرو نہیں ...... ادھر آجاؤ ......
یہاں ہوں''۔

میں نے دیکھا تو سوامی جی مجھے اپنے سیدھے ہاتھ پر کھڑ
ہوئے نظر آئے۔ کیونکہ یہ رات پورن ماشی کی رات تھی اور چاروں طرف چا
چٹکی ہوئی تھی' اس لئے مجھے سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں سوامی

لرف بڑھا اور پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ سوامی جی نے کہا۔

''تم چلنے کو راضی ہو علی حسن ! یہ جان کر ہمارے من کو بڑی
شانتی ہوئی اور ہمارا ہردے خوشی سے بھر گیا۔ جانتے ہو تم میں درگامائی کا چیلا
ننے کے بعد کتنی شکتی آجائے گی۔ تم جس شریر کو چاہو گے قبضہ کر سکو گے جو شریر بھی
تمہارے من کو بھائے گا تم اس میں داخل ہو کر اسے اپنا سکو گے چاہے وہ شریر کسی
بھی ویکتی کا ہو' چاہے وہ کوئی منش ہو یا کوئی جانور۔ پرنتو اس کے لئے تمہیں کچھ
شٹ اوشیہ بھوگنا پڑے گا۔ تمہیں درگامائی کے منتر کا جاپ کرنا ہوگا اور اپنا یہ دھرم
بھی تیاگنا ہوگا۔ تمہیں ہندو دھرم کا پالن کرنا ہوگا' اگر تم ہندو دھرم کا پالن کرتے
رہے تو تمہاری شکتی کوئی نہ چھین سکے گا اور اگر ہندو دھرم سے پھرنے کا وچار بھی تم
نے اپنے من میں کیا تو درگامائی تمہاری شکتی چھین لے گی۔ بولو تم اپنا دھرم تیاگنے پر
راضی ہو''۔

میں جو اس وقت اپنے والدین کی سختیوں کا شکار تھا ان سے چھٹکارا پانے
ے لئے ہر شرط ماننے پر تیار تھا اور پھر سوامی جی نے جس عجیب وغریب طاقت کا
ر کیا تھا کہ مجھ میں پیدا ہو جائے گی' اس پر بھی کچھ میرا جی للچایا' ایک نظر میں نے
اپنے نحیف اور کمزور جسم کو دیکھا جو کہ ہر چند بہت خوبصورت تھا' مگر طاقت ور ہرگز
نہیں تھا۔ اسی وجہ سے میرے والد شتاب علی جس طرح مجھے چاہتے تھے' مارتے پیٹتے
تھے اور میں ان کی مار سے بچنے تک کی اپنے اندر ہمت و طاقت نہیں پاتا تھا میرے
اس طرح نحیف وکمزور رہ جانے میں میرے والد کی مار اور ان کے خوف کو بھی بہت

دخل تھا اس لئے سوامی جی کے پوچھنے پر کہ کیا میں ہر طرح راضی ہوں میں نے جواب دیا۔

''سوامی جی! میں ہر شرط ماننے کو تیار ہوں آپ مجھے جلد سے جلد درگا مائی کے پاس لے چلئے۔''

اتنا سنتے ہی سوامی جی نے کہا۔

''دھنیہ ہو بچہ دھنیہ ہو!'' اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر زور سے ''جے بجرنگ بلی'' کا نعرہ مارا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں سوامی اوم پرکاش جی کے ساتھ ہواؤں میں آسمان کی طرف اڑتا چلا جا رہا ہوں میرے سر پر سوامی جی کا ہاتھ تھا اور میری آنکھیں دھیرے دھیرے ایک مسحور کن خوشی سے بند ہوتی جا رہی تھیں۔



میں تم سے اس کیفیت کا اظہار نہیں کرسکتا بس یوں سمجھو کہ وہ لمحے ہ
اور بے ہوش کے درمیان تھے۔ نہ تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں بالکل بے ہوش
اور نہ یہ کہ سب کچھ اپنی انکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ بس مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھ
میرے سر پر کسی غیبی طاقت کا ہاتھ ہے اور میں لامحدود فضاؤں میں اونچا اور ا
اڑتا چلا جا رہا ہوں۔ میرا دل اس وقت ایک عجیب سی مسرت سے ہمکنار تھا۔ ا
ایسی خوشی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔ مجھ پر اس وقت ایک خواب کا سا
طاری تھا۔ نہ مجھے اس وقت اس کا احساس تھا کہ میں ایک زندگی چھوڑ کر دو
زندگی میں داخل ہو رہا ہوں اور نہ یہ خیال تھا کہ میرے ساتھ سوامی اوم پرکاش
بھی آسمان کی بیکراں وسعتوں میں پرواز کر رہے ہیں۔ مجھ پر ایک سرور کی
کیفیت نہ معلوم کتنی دیر طارق رہی مجھے جب پوری طرح ہوش آیا تو میں نے د
کہ میں سوامی جی کے ساتھ ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوں۔ مجھے اچھی طرح

ے کہ ''جے بجرنگ بلی'' کے نعرے سے میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دی
یں۔ یہ وقت کچھ صبح کے جھٹپٹے کا سا تھا۔ میں نے دیکھا کہ جہاں میں کھڑا ہوں
ں کی بلندی سے ہزاروں فٹ نیچے گہرے گہرے کھڈ اور وادیوں کا سلسلہ سا
ھائی دیتا ہے اور چاروں طرف سے پہاڑیاں ہی پہاڑیاں ہیں۔ چند ہی لمحوں
ں مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔

سوامی جی نے میری اس کیفیت کو دیکھا تو کہا ''بچہ اب تم ایک نیا جیون
روع کر رہے ہو۔ تمہیں اس کے لئے بلیدان دینا تھا سو تم نے دیا۔ اپنے ماتا پیتا
ب کو تم نے تیاگ دیا اور درگا مائی کا چیلا ہونا سویکار کیا۔ دھنیہ ہو۔ بھگوان تمہیں
لتی دیں آؤ پہلے کچھ جل پان ہو جائے۔'' یہ کہہ کر سوامی جی میرا ہاتھ پکڑا اور ہم
ہاڑ کی چوٹی سے آہستہ آہستہ اترنا شروع ہوئے۔ یہ ایک گپھا سی تھی جس میں
امی جی مجھے لے گئے۔ گپھا میں گھستے ہی سوامی جی بولے ''بچہ! دیکھو یہ ہمارا
تھان ہے۔'' میں نے دیکھا کہ گپھا میں سوائے ایک بڑے سے بت کے کچھ بھی
یں تھا میں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا اور دل ہی دل میں یہ سوچنے لگا کہ اتنا بڑا
ت اس گپھا میں کس طرح آیا ہوگا۔ گپھا اندر سے بہت اونچی اور چوڑی تھی مگر
اس میں داخل ہونے کا راستہ اتنا تنگ تھا۔ کہ بڑی مشکل سے دو آدمی بیک وقت
اس میں داخل ہو سکتے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ میرے دل میں یہ خیال بھی گزرا

کہ آخر اس بت کو یہاں لایا کون۔؟ میں ابھی انہیں وسوسوں میں تھا کہ سوامی
کی آواز نے میرے سلسلہ خیال کو توڑ دیا۔''ہم جانتے ہیں کہ تم حیران ہو گئے
بھگوان یہاں کس طرح آئے۔سو سنو بچہ! بھگوان کے پاس جاؤ تمہیں معلوم ہو
کہ بھگوان نے انہیں پتھروں سے جنم لیا ہے۔''میں سوامی جی کے کہنے پر ذرا
ذرا اس بت کے قریب پہنچا جس کا سر گپھا کی چھت سے لگا ہوا تھا میں اس کے
سامنے کھڑا ہوا اپنے آپ کو بڑا حقیر سا سمجھ رہا تھا اب بت کے قریب جا کر مجھے
ایک بات کا اور احساس ہوا کہ گپھا میں روشنی کہاں سے آرہی ہے؟۔اب جو میں
نے غور کیا تو دیکھا کہ اس بت کے چہرے کے گرد ایک روشنی کا ہالہ سا تھا جس سے
تمام گپھا روشن تھی۔ بت دیوار سے بالکل جڑا ہوا تھا قریب جا کر دیکھنے سے مجھ
یہ راز بھی کھل گیا کہ بت کو کہیں سے لایا نہیں گیا بلکہ وہ گپھا ہی میں' گپھا کی دیوا
سے تراشا ہوا معلوم ہوتا تھا۔دیوار اور بت کے درمیان کوئی جوڑ نہیں تھا ایسا لگتا
کہ جیسے بت دیوار سے آگا ہو۔میں بت کے دیکھنے میں اتنا محو ہوا کہ مجھے
احساس ہی نہ رہا کہ میرے ساتھ اور کوئی بھی ہے بت بلاشبہ اتنا بڑا تھا کہ بمشکل
میرا سر اس کے گھٹنے تک پہنچتا تھا حالانکہ وہ اس طرح بنا تھا یا بنایا گیا تھا کہ جیسے
کوئی الٹی پالتی مار کر بیٹھ گیا ہو۔میں بغور بت کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا اس
ایک ہاتھ اٹھا ہوا تھا اور دوسرا گھٹنے پر رکھا تھا۔میں نے بت کو اچھی طرح دیکھ

کے بعد کہا۔سوامی جی! یہ کس کا بت ہے؟۔مگر جواب ندارد۔میں نے پلٹ کر
دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔سوامی اوم پرکاش غائب تھے میں ایک دم گھبرا سا
گیا اور فوراً گپھا کے دروازے یا راستے کی طرف بڑھا۔میں نے جیسے ہی چاہا کہ
گپھا سے نکلوں کہ ایک بہت زور سے پھنکار سنائی دی اب جو غور سے دیکھا تو بیچ
راستے میں ایک کالے بھنور سانپ کو پھن کاڑھے بیٹھا دیکھا۔میں الٹے قدموں
پھر گپھا میں بھاگا اور بہت خوفزدہ سا ہو گیا۔اور سوچنے لگا کہ یہ کیا ماجرہ ہے؟
سوامی جی کہاں گئے اور سانپ کمبخت کہاں سے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔یہ تو
بہت برا ہوا۔اب کیا ہو گا۔؟ نہ تو میرے پاس کچھ اوڑھنے بچھانے کو ہے اور نہ
کھانے۔کھانے کا خیال آتے ہی بھوک چمک اٹھی مجھے یاد آیا کہ رات خوشی کے
سبب میں نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔دوسرے یہ خوف الگ تھا کہ ایک سانپ گھپا
کے راستے میں موجود ہے' نہ معلوم کب وہ گھپا میں آجائے اور حملہ کر دے۔گھپا میں
بظاہر کوئی ایسا اوزار یا کوئی اور چیز بھی نہیں تھی جس سے میں اپنی مدافعت کر
سکتا۔سوائے اسکے کہ چپ چاپ موت کی نیند سو جاؤں ایک ہی لمحے میں میرے
دل میں خیال گزرا کہ میں نے یہاں آکر اور اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر برا کیا۔اتنا
سوچنا تھا کہ مجھے ایسا لگا کہ میرے پاؤں کے نیچے زمین بہت زور سے ہل رہی ہے
اور پھر شور قیامت کا۔میں اس وقت کھڑا ہوا تھا ڈر کر فوراً بیٹھ گیا۔اور اپنے

دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں مگر شور تھا کہ اب بھی میرے کانوں میں گو
جا رہا تھا جیسے بجلیاں کڑک رہی ہیں مجھے ایک دفعہ ایسا لگا کہ جیسے گھپا کی چھت
پر گرنے والی ہو میں نے ایک نظر بت کی طرف دیکھا اور میرے منہ سے چیخ نکل
گئی۔ بت میرے اوپر گر رہا تھا۔ میں نے ایک آخری چیخ ماری اور بے ہو
ہو گیا۔

پھر جو میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ سوامی جی میرے اوپر جھ
ہوئے ہیں اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہے ہیں۔ میں نے پوری طرح آنکھیں
کھول دیں۔ میں اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ سوامی جی نے کہا۔ ''وشرام کرو
وشرام! بھگوان تم پر اپنی دیا کریں تم نے کیا وچار کیا تھا اپنے من میں؟۔ اب
میں نے چاروں طرف نظر کی تو دیکھا کہ نہ تو وہ گھپا ہے نہ وہ بت اور نہ وہ ماحو
۔ میرے سر پر کھلا آسمان تھا۔ دن پوری طرح نمودار ہو چکا تھا۔ میں نے سوامی
کو بتایا کہ ان کے جانے کے بعد مجھ پر کیا گزاری۔ مگر اس زلزلے کی وجہ
میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر میں سوامی جی کو بتاتا بھی کیا۔ سوامی جی نے
۔'' بھگوان تم سے نہ جانے کیوں ایک دم ایسے روٹھ گئے کہ تمہیں ایک پل بھی ا
پاس رکھنا سویکار نہ کیا۔ پرنتو کیونکہ تم درگامائی کا جاپ کرنے آئے تھے اس۔
تمہیں انہوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ پر میں کہتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی اس

کارنٹر اوشیہ ہے۔ تم یاد کرو کہ جسے سمے میں تمہیں چھوڑ کر گیا تو مہارے من میں کیا
وچار آیا؟''۔ سوامی جی کے کہنے پر مجھے دھیان آیا کہ واقعی میں نے یہ سوچا تھا
کہ یہاں آ کر میں نے برا کیا۔ میں نے یہ سوامی جی کو بتایا۔ انہوں نے کہا
''اوشیہ اوشیہ' یہی کارنٹر ہوگا ورنہ بھگوان آج تک کسی سے اس طرح نہیں
روٹھے۔'' میں نے کہا ''مگر آپ کہاں چلے گئے تھے سوامی جی؟ سوامی جی بولے
''ہم کہاں جاتے ہم تو تمہارے بھوجن کے لئے گئے تھے۔ کھانے کا نام سنکر پھر
میرے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ میں نے کہا۔'' سوامی جی کہاں ہے کھانا
مجھے بہت زور کی بھوک لگی ہے اگر کچھ گوشت مل جائے تو کیا اچھا ہو۔'' میری
بات سن کر سوامی نے ایک دم کہا۔'' پاپ' پاپ مہا پاپ ایسا وچار بھی کبھی من میں
نہ لانا۔ اب تم ماس نہیں کھا سکتے پرنتو ہم نے تمہارے من بھات بھوجن کی آ گیا
درگامائی سے لے لی ہے۔ لو اٹھو تمہیں کھجوریں بہت پسند ہیں یہ کھجوریں خاص طور
تمہارے لئے بصرے سے منگوائی گئی ہیں۔ اٹھو'' میں اٹھ کر بیٹھ گیا اب جو میں
نے دیکھا تو ایک پتے پر صرف تین کھجوریں رکھی ہیں اور ایک چھوٹی سی پیالی میں دو
گھونٹ دودھ رکھا ہے یہ دیکھ کر میرا جی بہت کڑھا کہ لو یہ ہے کھانا۔ اس سے کیا
خاک پیٹ بھرے گا۔ مگر میں نے اس بات کا اظہار سوامی جی نے نہیں کیا اور ایک
کھجور اٹھا کر منہ میں رکھ لی' پھر کھجوروں کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بقیہ دو بھی اپنی

دانستہ میں اٹھا کر کھالیں اور اب پیالی کے دودھ کو میں نے پینا چاہا جیسے ہی
نے پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میری نظر اس پتے پر پڑی جس پر سے کھجوریں ا
کر میں نے کھائی تھیں۔ میں نے اپنے منہ میں کھجوروں کا ذائقہ محسوس کیا۔ ا
حیرت سے پتے پر رکھی ہوئی کھجوروں کو دیکھنے لگا۔ میری یہ حالت دیکھ کر سوامی
بولے۔ بچہ !!! اچمبھا نہ کر ! یہ سب بھگوان کی لیلا ہے کھا اور پیٹ بھر کر کھا۔ دود
پی اور پٹ بھر کر پی جو دیکھتا ہے اس کے دھوکے میں نہ آ۔ ان آنکھوں پر وشوا
چھوڑ دے اور آتما کی آنکھیں کھول۔ سب کچھ تو جان جائے گا۔ ابھی تجھے بہ
کچھ پرایت کرنا ہے۔'' میں نے سوامی جی کے ہمت بندھانے پر دودھ کی پیا
اٹھائی اور منہ سے لگالی دودھ بہت مزے دار اور میٹھا تھا میں گھونٹ پر گھونٹ پ
گیا یہاں تک کہ خوب سیر ہو گیا اور پیالی پھر زمین پر رکھ دی۔ دیکھا تو پیالی جو
کی توں دودھ سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ میں نے کچھ کھجوریں اور کھائیں او
سے پھر دو چار گھونٹ دودھ پیا۔ اب میں بالکل شکم سیر ہو چکا تھا۔ سوامی جی نے ک
۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب تمہارے شیریر میں شکتی آ گئی ہو گی اور تم چلنے کے یوگ ہو
سو آؤ چلو میں تمہیں درگا مائی کو سونپ آؤں۔ میں نے کہا چلئے۔ اور وہ سانپ کا ک
معاملہ تھا۔ میں نے لاکھ چاہا کہ گھپا سے نکل جاؤں مگر وہ راستے میں اس طرح پھر
کاڑھ کر بیٹھا تھا کہ میں گھپا سے نکل ہی نہیں سکتا تھا۔'' اس پر سوامی جی نے کہا'' و

ناگ دیوتا تھے۔ ہم کو یہ جانکاری تھی کہ تم ہمیں نہ پا کر گھپا سے نکلنے کے اپائے
سوچو گے سو ہم نے انہیں اس کاریہ پر لگا دیا تھا کہ وہ تمہیں گھپا سے نہ نکلنے دیں۔ سو
ایسا ہی ہوا۔ پرنتو تم نے اپنے من میں غلط وچار کر کے بھگوان کو دکھ پہنچایا۔ درگا مائی
کے کارن بھگوان نے تمہیں چھمی کر دیا ورنہ جلا کر بھسم کر دیتے۔ یہ کہہ کر سوامی جی
اٹھے اور مجھ سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ اب ہم پہاڑ سے نیچے اتر رہے تھے۔ ایک
جگہ پہنچ کر سوامی جی رک گئے یہ ایک تنگ سا راستہ تھا جس کے ایک طرف گہری
کھائی تھی۔ ہزاروں فٹ گہری اور سیدھے ہاتھ کی طرف ایک بہت چھوٹی سی
پگڈنڈی اندر کو جا رہی تھی۔ پہاڑ کے اندر ایسا لگتا تھا کہ جیسے ہم کسی بڑے غار کے
دہانے پر کھڑے ہوں۔ اپنے بائیں طرف ہزاروں فٹ گہری کھائی کو دیکھ کر میرا
دل دہل گیا میں ابھی اسی سوچ میں تھا کہ سوامی جی نے کہا۔'' اچھا بچہ !!! اس سے
آگے جانے کی ہمیں آگیا نہیں ہے۔ تم اس کے بعد اکیلے جاؤ گے۔ تمہارے
سیدھی طرف یہ جو راستہ دکھائی پڑتا ہے یہی درگا مائی تک تمہیں لے جائے گا۔ ہمیں
اگر آگیا ہوتی تو ضرور تمہارے ساتھ چلتے پرنتو ایسا نہیں تم چنتا نہ کرو بھگوان تمہاری
سہائتا کریں گے۔ یہ کہہ کر سوامی جی نے'' جے بجیر نگ بلی'' کا نعرہ مارا اور میری
آنکھوں نے ایک عجیب حیرتناک اور ناقابل یقین منظر دیکھا۔ سوامی جی ہزاروں
فٹ گہری کھائی کے اوپر اڑتے ہوئے دوسری پہاڑی کی طرف جا رہے تھے میں

بڑی دیر تک بھونچکا سا ہو کر انہیں دیکھتا رہا اس وقت تک جب تک کہ وہ دوسر
پہاڑی کے پیچھے جا کر میری آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئے۔

تم خود سوچ سکتے ہو کہ اس وقت میرا دل کتنے عجیب و غریب وسوسوں ا
جذبات سے بھر گیا ہوگا جب میں نے اس ماحول میں اپنے آپ کو تنہا پایا ہوگا
میں نے ایک نظر پھر ہمت کر کے گہری کھائی کی طرف دیکھا اور پھر دوسری طرف
اس تنگ سے راستے پر نظر کی۔ اب میرے دل میں اگر کوئی ایسا ویسا غلط جذبہ ابھ
یا میرے ذہن میں خوف کے سبب کچھ اور خیال آتا فوراً اسے جھٹک دیتا کہ کہیں
ایسا نہ ہو کہ پھر میں کسی مصیبت کا شکار ہو جاؤں اس وقت تک میں اپنی آنکھو
سے بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔ بقیہ ہوش و حواس جو اگر مجھے کوئی دوسرا سناتا تو کبھ
یقین نہ کرتا مگر اس تجربے کو کس طرح جھٹلایا جا سکتا ہے۔ میرے لئے تو کھجور وا
والا واقعہ اور سوامی جی کا اس طرح ہوا میں اڑنا ہی بڑی حیرت انگیز باتیں تھی
۔ میں نے ایک مرتبہ دل سے تمام خوف کو جھٹکا اور سوامی جی کے بتائے ہوئے
راستے پر آگے بڑھا ابھی میں کچھ دور ہی چلا ہونگا کہ میں نے محسوس کیا کہ آگے
راستہ کچھ روشن سا ہے۔ اس لئے کہ جب میں پہلے پہل اور ادھر بڑھا تو راستہ ا
واضح اور روشن نہیں تھا بلکہ دھندلا سا تھا جیسے صبح کاذب سے پہلے کا سماں میں پہا
کے اندر سفر کر رہا تھا۔ جہاں سے میں نے اپنا سفر شروع کیا تھا مجھے ایسا لگا تھا کہ

جیسے میں کسی بڑے غار کے دہانے پر ہوں پھر ذرا آگے بڑھ کر یہ احساس ہوا تھا
کہ میں کسی سرنگ میں آگے بڑھ رہا ہوں لیکن راستہ اسی طرح نیم تاریک سا تھا
مگر اب جب کہ میں نے کچھ فاصلہ طے کر لیا تو مجھے ہلکی ہلکی روشنی کا سا احساس ہوا
اور جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا روشنی اسی قدر بڑھتی گئی یہاں تک کہ مجھے ہر چیز
واضح نظر آنے لگی یہ واقعی ایک پہاڑی سرنگ تھی ایک عجیب بات یہ کہ مجھے اس میں
آگے بڑھتے ہوئے کسی گھٹن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے روشنی
سرنگ کی دیواروں سے پھوٹ رہی ہوں۔ بہت ٹھنڈی اور ہلکی ہلکی خوابناک سی
روشنی دودھیا روشنی سرنگ میں دور تک چلی گئی تھی میں آگے بڑھتا گیا یہاں تک کہ
مجھے یہ لگا کہ اب روشنی کی حد ختم ہو رہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ اب روشنی سمٹ کر
صرف سرنگ کی زمین تک محدود ہو گئی ہے اور اسکے ساتھ ہی مجھے ہلکی ہلکی ٹھنڈ کا سا
احساس ہوا۔ مگر یہ ٹھنڈک ناقابل برداشت نہیں تھی۔ اب مجھے ایک نیا سا احساس
ہوا کہ دودھیا روشنی کی دھار بہت آگے جا کر سرنگ کی سطح میں اترتی جا رہی ہے
۔ میں اس جگہ تک پہنچنے کے لئے جلدی جلدی چلنے لگا۔ اب میرے کانوں میں
آہستہ گھنٹیاں سی بجنے کی آواز بھی آ رہی تھی اور ایک عجیب سی نامانوس خوشبو بھی
مجھے اپنے وجود میں اترتی محسوس ہو رہی تھی ایک ایسی خوشبو جو اس سے پہلے میں
نے کبھی محسوس نہیں کی تھی اس خوشبو کی مثال کسی اور خوشبو سے دی ہی نہیں جا سکتی

گھنٹیوں کی آواز آہستہ آہستہ ایک مدھم لے کے ساتھ بڑھتی جارہی تھی میں کچھ ہی دیر بعد اس جگہ پہنچ گیا جہاں میں نے دیکھا کہ دودھیا روشنی ایک دھار کی سی صورت میں ہے پتھریلی سیڑھیاں ہیں نیچے اترنے کے لئے گھنٹیوں کی آواز جو اب گھنٹوں کی سی آواز میں تبدیل ہو چکی تھی اور پہلے سے کچھ تیز تھی ادھر ہی سے آرہی تھی۔ میں سیڑھیاں اترنے لگا اور اس آواز کی سمت کا تعین کرنے لگا۔ خوشبو بھی اب پہلے سے زیادہ تھی مگر ناگوار حد تک نہیں۔ میں سیڑھیاں اترتا رہا۔ یہاں تک کہ میں ایک بہت بڑے گول سے ہال نما کمرے میں پہنچ گیا جس میں بڑے بڑے ستون' پتھریلے ستون بہت اونچائی پر جا کر اس گول کمرے کی چھت سے مل گئے تھے۔ یہ پتھریلے ستون بھی گول اور چکنے تھے اور ایک گول دائرے کی صورت میں تھے میں اس ستونوں کے دائرے میں داخل ہوا اور میری آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک بڑے گول چبوترے پر ایک گول اور سڈول سی عورت بیٹھی تھی پالتی مارے ہوئے مگر یہ عورت کب تھی اس کے تو آٹھ ہاتھ تھے سر پر ایک تاج سا رکھا ہوا تھا جو جگ مگ کر رہا تھا اس کے چہرے کے چاروں طرف بھی ایک نورانی ہالہ سا تھا۔ اور اس دودھیا نورانی ہالے میں اس عورت کا کالا سیا چمکدار چہرہ بھیانک اور ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر بھی کالے تھے اس کے کسی ہاتھ میں سنکھ' کسی میں چکر' کسی میں ترشول' کسی میں کوئی بت ہوگا مگر جب میں نے

دیکھا کہ اس کے ہاتھ باقاعدہ حرکت بھی کرتے ہیں تو مجھ پر ایک دہشت سی طاری ہوگئی۔ میں اسے دیکھنے میں اتنا منہمک سا تھا کہ مجھے کسی اور شے کا احساس ہی نہیں تھا۔ نہ خوشبو کا' نہ روشنی کا اور نہ گھنٹوں کا جو چھت سے لٹکے ہوئے تھے اور خود بخود بج رہے تھے۔ میری یہ تمام حیرت اور یہ سب کچھ دیکھنا صرف چند لمحوں کا کھیل تھا کہ اس عورت کے ہونٹوں پر جنبش ہوئی۔ درگا نے تمہیں سویکار کیا آجاؤ ہم سے دھیان لگاؤ اور ہمارا پالن کرو جب تم ہمارا جاپ پورا کرلو گے ہم تمہیں شکتی پراپت کردیں گے۔ جاپ کا شبد اور گیان سویم ہم ہیں۔ درگا نام جپو۔ اس سمے تک جپو جب تک تمہاری آتما پوتر نہ ہوجائے۔ اس میں سمے کا اور چھوڑ نہیں۔ پرنتو تمہیں کسی اور منشیہ کے سمان اسکی چنتا نہ ہوگی کہ تمہارا شریر کس حال میں ہے اور نہ ہی تمہیں کچھ کھانے پینے کی چنتا ہوگی۔ درگا تمہاری آتما اور شریر کی رکھشا کریگی پر دیکھو جب ہم سے دھیان لگاؤ تو کوئی اور وچار من میں نہ لانا اس سے یہ ہوگا کہ تم کشٹ بھوگنے سے بچے رہو گے تمہیں دوسرے دیوی دیوتا کوئی کشٹ نہ دے پائیں گے۔ تم سے دیوتا بجرنگ بلی پہلے ہی روٹھ چکا ہے اسے ہم نے شانت کردیا ہے پرنتو تم آگے کی طرف دیکھو یہ راستہ تمہیں اس استھان تک لے جائے گا جہاں پہنچ کر تم ہمارا نام جپو گے۔ یہ راستہ جہاں ختم ہو تم وہیں بیٹھ رہنا درگا کا چیلا ہونا تمہیں سپھل بنادے گا۔ ہماری آشیرباد تمہارے ساتھ سدا رہے گی اگر تم نے ہندو

دھرم اور ہمارا ساتھ نہ چھوڑا اور ہمارا پالن کرتے رہے۔ آؤ ہمارے چرنوں آ جاؤ! آج سے تم علی حسن نہیں۔ درگا کے داس ہو۔ درگا کا چیلا ہونے کا اس تمہیں اس سمے ملے گا جب تم جاپ پورا کر لو گے ہمارا من جب بھی تمہار جاپ سے شانت ہو گیا ہم تمہیں تمہاری بھگتی کے بدلے شکتی پراپت کر دیں۔ سکھی رہو۔ سدا سکھی رہو۔

ان الفاظ میں ایک عجیب جادو سا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے یہ میرے وجود میں اتر رہے ہوں آہستہ آہستہ بہت غیر محسوس طور پر اور اب سوائے ان لفظوں کے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ یہ کیوں آیا ہوں؟ میرا کیا منشا ہے؟ میں کس کی اولاد ہوں؟ میرا مذہب کیا ہے؟ سب کچھ بھولتا جا رہا تھا اور ایک عجیب بے خودی کے عالم میں درگا مائی کی طر بڑھ رہا تھا میں نہ جانے کس طرح اس تک پہنچا اور کتنی دیر میں مجھے بالکل یاد لیکن جب میں نے درگا مائی کے پیروں کو چھوا تو مجھے ایسا لگا جیسے ایک کرنٹ سا لگا۔ میں نے اپنے سر پر کوئی ہاتھ محسوس کیا اور ساتھ ساتھ یہ آواز سنی۔ ''سکھی درگا نے تمہیں اپنا داس بنانا سوئیکار کیا۔ سب کچھ بھول جاؤ' درگا کے سوا سب بھول جاؤ اس سمے تک جب تک کہ جاپ پورا نہ کر لو بھول جاؤ۔ بھول جاؤ مجھے اس آواز کے ساتھ ہی ساتھ ایسا لگا جیسے کوئی میرے ذہن سے کچھ کھرچ

ہو۔ ایک ایک کر کے بہت سے منظر میرے قصبے کے میری آنکھوں کے سامنے آتے رہے جاتے رہے۔ اور رفتہ رفتہ ایک بے خودی کے سے عالم میں ہیں سب کچھ بھولتا گیا۔ اب میرے ذہن میں سوائے درگا مائی کے کچھ نہیں تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ اب سارا خوف بھی میرے دل سے آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے یہاں تک کہ بس مجھے اتنا یاد رہ گیا کہ میں درگا مائی کا داس ہوں' اور مجھے جاپ پورا کرنا ہے۔ میں درگا مائی کے پیر چھو کر ذرا پیچھے ہٹا اور ''جے درگا مائی'' کا نعرہ مارا۔ گھنٹے زور زور سے خود بخود بجنے لگے اور میرے قدم خود بخود دائیں طرف اٹھ گئے جہاں سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ میرا دل ہر جذبے سے خالی تھا سوائے درگا مائی کے۔ اور اب میرے ذہن میں بھی سوائے درگا مائی کے کسی کا خیال نہیں تھا۔ میں نے سیڑھیاں طے کیں اور پھر ایک سرنگ میں داخل ہو گیا۔ یہ سرنگ بھی روشن تھی اور دور تک چلی گئی تھی۔ میں اس میں آگے بڑھتا رہا یہاں تک روشنی مدھم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئی اب نیم تاریکی سی تھی اور اس کے آگے اندھیرا مگر مجھے اب اس نیم تاریکی یا اندھیرے سے کوئی زرہ برابر خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا میں نے اس اندھیرے کو بھی عبور کیا۔ اب میں ایک نہایت تنگ سے راستے پر چل رہا تھا۔ رفتہ رفتہ پھر مجھے ہلکا سا اجالا محسوس ہوا مگر یہ اس روشنی سے مختلف تھا جسے میں پیچھے چھوڑ آیا تھا آہستہ آہستہ میں پوری طرح اجالے میں آ گیا سرنگ ختم ہو چکی تھی۔

میں باہر نکلا۔ اس سے آگے راستہ ختم ہو گیا تھا اور گہری کھائی تھی میں آگے بڑھا اور
نیچے دیکھا۔ ہزاروں فٹ گہری کھائی میرے سامنے تھی لیکن مجھے اس سے کوئی
خوف یا ڈر محسوس نہیں ہو رہا تھا یکایک ایک بہت زور کی آواز سے میں چونکا اور
جوگی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو نہ وہاں سرنگ تھی نہ کوئی راستہ۔ وہ تو پتھریلی دیواری
تھی۔ وہاں بمشکل اتنی جگہ ہوگی کہ میں پالتی مار کر بیٹھ سکتا تھا یا کھڑا ہو سکتا تھا
دائیں بائیں بھی کوئی راستہ نہ تھا نہ اور کسی طرف' سامنے کھائی تھی ہی' مجھے اس
صورت حال نے ذرا پریشان نہ کیا۔ اور میں التی پالتی مار کر وہاں بیٹھ گیا۔ دور
تک میرے سامنے پہاڑیوں کے سلسلے تھے اور بیچ میں گہری کھائی۔

میرے ذہن میں اس وقت پھر درگامائی کے الفاظ گونجے۔ جیسے کوئی
میرے اندر بیٹھا ہوا مجھ سے کہہ رہا ہو۔ ''ہم سے دھیان لگاؤ اور ہمارا جاپ کرو
ورنہ درگا نام جپو' درگا نام جپو' اور میں درگا نام جپنے لگا اس وقت نہ تو مجھے وقت کا
احساس تھا نہ کسی اور شے کا بس آلتی پالتی مارے درگا نام جپ رہا تھا دن تمام ہوا
رات آئی میں اسی طرح درگا نام جپتا رہا پھر دن ہوا پھر رات آئی' اور نہ جانے
کتنے دن کتنی راتیں یوں ہی آتی جاتی رہیں اور میں درگا نام جپتا رہا' آہستہ آہستہ
مجھ پر ایک بے خودی کی سی کیفیت طاری ہوتی گئی۔ دن رات اسی طرح گزرتے
رہے۔ اور عجیب بات یہ کہ نہ تو میرے ذہن میں کوئی اور خیال آیا اور نہ ہی مجھے

اپنے جسم میں کسی کمزوری کا احساس ہوا۔ نہ بھوک اور پیاس نے ستایا۔ بلکہ مجھ میں
ایک عجیب قوت سی آگئی۔ ایک ہلکا پن سا ایک بے خودی سی ایک خواب کی سی
کیفیت مجھ پر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ طاری ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ میں خود
کو بھی بھول گیا۔ اپنے وجود تک کا احساس مجھ میں سے نکل گیا۔ اور اسی طرح
آلتی پالتی مارے بیٹھا رہا' اور درگا مائی کا نام جپتا رہا ایک عجیب سرور سا ایک گہری
بے خودی سی ایک بہت سکون بخش خواب سا ایک بے نام لذت سی تھی۔ نہ جانے
کب تک میں اس کیفیت میں رہا' میں نہیں بتا سکتا کہ نہ جانے کب مجھے ایک آشنا
سی آواز نے اس کیفیت سے باہر کھینچ لیا' یہ آواز مجھے اپنے وجود سے' اپنے اندر
سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ''جا تو سپھل ہو گیا' درگا نے تجھے اپنا بنا لیا' تجھے شکتی
پراپت کر دی' جا درگا نے تجھ پر اپنی دیا کی' تجھے سویکار کیا' تیرا جاپ سپھل ہوا۔''

اس کے بعد میرا شعور پوری طرح بیدار ہو گیا میں نے آنکھیں کھولیں تو
وہی وقت تھا جب میں یہاں آسن مار کر بیٹھا تھا۔ مجھے سب کچھ یاد آنے لگا۔
آہستہ آہستہ تمام یادیں میرے ذہن میں گھوم گئیں۔ میں نے اپنے چاروں
طرف نظر کی۔ راستہ کہیں نہیں تھا سامنے اسی طرح وہ کھائی موجود تھی پیچھے پہاڑ کی
دیوار تھی میں نے اٹھ کر کھڑا ہونا چاہا۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر عجیب سا احساس ہوا کہ میں
ہل بھی نہیں سکتا صرف دیکھ سکتا اور سوچ سکتا ہوں۔ میرے نچلے دھڑ کو دیمک لگ

چکی تھی میں نے ذرا کوشش سے گردن ادھر ادھر گھما کر اپنے جسم کو دیکھا معلوم ہو
کہ ایک ہڈیوں کا پنجر سا ہے جو نیچے سے تقریباً گل چکا ہے۔ میرے دونوں پاؤں
اور دھڑ بالکل بیکار ہو چکے تھے ہاتھ بھی جس طرح رکھے تھے اسی حالت میں اک
کر سوکھ گئے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے ایک پرند اڑا کر گیا اور پھ
پرندوں کی ڈار کی ڈار اڑی' میرے اندر ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی۔ کاش
میں پرندہ ہوتا تو ان وادیوں اور پہاڑوں پر کیسا منڈلاتا پھرتا کسی نے پھر جیسے
میرے اندر سے ہی جواب دیا ''اب تو تو سب کچھ ہو سکتا ہے'' تو نے ہمارا جاپ
پورا کر لیا اور اب تو جس شریر پر چاہے قبضہ کر سکتا ہے اور جسے چاہے چھوڑ سکتا ہے
جس شیریر میں چاہے جا سکتا ہے۔ اپنی شکتی پہچان' پرنتو ایک شریر ایک دفعہ چھوڑ کر
دوبارہ اس میں نہیں جا سکتا۔ چاہے وہ شریر کسی منشیہ کا ہو چاہے کسی چرند پرند کا۔
اب درگا کا چیلا ہے ہم نے تجھے شکتی پرایت کر دی ہے اب یہ تیری رکھشا ہے کہ
اسی شریر میں رہے یا کسی اور منشیہ یا چرند پرند کے شریر میں۔'' یہ آواز آتے ہی
جیسے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گا اور ایک نظر پھر میں نے اپنے سڑے گلے جسم
ڈالی اور پوری قوت جمع کر کے ''جے درگامائی'' کا نعرہ مارا اور مجھے لگا کہ ایک جھٹکے
کے ساتھ میں اپنا جسم چھوڑ چکا ہوں۔ سامنے سے ایک پرند اڑ کر جا رہا تھا میں
نے اپنے دل میں اس کا خیال کیا اور مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں ہواؤں میں تیر

وں' خود بخود میرے پر ہوا کر چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے میں آگے
ھتے بڑھتے ایک مرتبہ پھر پلٹا مجھے ایک عجیب سا خوشی اور رنج کا ملا جلا سا
ساس ہو رہا تھا میں سمٹ کر کتنا سا ہو گیا۔ اب میں ایک پرندے کے جسم میں تھا۔
ں پلٹا اور اس پہاڑی کا ایک چکر کاٹا۔ ایک جگہ پہاڑی میں مجھے ایک ڈھانچا سا
ا ہوا دکھائی دیا میں اڑ کر قریب پہنچا اور اس ڈھانچے کے برابر بیٹھ گیا۔ معاً مجھے
یال آیا یہ تو میں نہیں ہوں۔ میں کہاں ہوں؟ پرندے کے جسم میں مجھے وہ جسم اپنا
اگا۔ سڑا سڑ' ڈھانچا سا' میں نے اس پر بیٹ کر دی۔ اور وہاں سے اڑ گیا۔
میری منزل کہاں تھی۔؟ یہ مجھے اب خبر نہیں تھی البتہ ایک خیال سا اپنے
ے دھرم پور کا تھا کہ میں جاؤں میں یوں ہی بے مقصد بہت دیر تک اڑتا رہا دور
ور تک سوائے پہاڑی سلسلوں کے وہاں کچھ بھی نہ تھا کوئی آدمی یا جانور نظر ہی
یں پڑتا تھا۔ میں یوں ہی ایک سمت میں اڑنے لگا۔ اور اپنی پرواز میں نے ذرا
نی کر دی۔ تھوڑی ہی دور ابھی اڑا ہوں گا کہ مجھے نیچے بہت نیچے سینکڑوں فٹ
ے ایک پہاڑی کے دامن میں کچھ حرکت سی نظر آئی میں نے ایک غوطہ کھایا اور
لا بازیاں سی کھاتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ اس وقت کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔
مجھے اس طرح اڑنے میں ایک عجیب سی لذت محسوس ہو رہی تھی ہاں میرے بازو
ھ دکھنے ضرور لگے تھے جن کا مجھے اس خوشی کے موقع پر کوئی زیادہ احساس نہ ہو رہا

تھا۔ مجھے اب نیچے صاف دکھائی دینے لگا ایک شخص گھوڑے پر سوار سرپٹ دو
چلا جا رہا ہے میں اس کے ساتھ ساتھ اڑنے لگا اور اپنی اڑان بھی میں نے ذرا تی
کر لی وہ شخص جوان تھا۔ بہت خوبصورت۔ یہ بڑی بڑی مونچھیں بڑی ہی بڑ
آنکھیں' چوڑا چکلا سینہ گورا رنگ سر پر پگڑی بندھی ہوئی اور کاندے پر بند
پڑی ہوئی تھی وہ بہترین شہسوار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی ایک ایک ادا مجھے بہت بھا
۔ اور میں نے اپنی چونچ کھول کر ''جے درگامائی'' کا نعرہ مارا جو بہت کچھ ''ق
قیں'' سے ملتا جلتا تھا۔ اور ایک مرتبہ ایک جھٹکے کے ساتھ ہی اس پرندکا جسم چھوڑ
اور اس نوجوان گھڑسوار کے جسم میں داخل ہو گیا اس گھڑسوار کو ایک جھرجھری
آئی اور اب میں اس میں تھا میں نے گھوڑے کی لگامیں ذرا کھینچیں۔ اور پیچھے مڑ
دیکھا تو پرندکا جسم مردہ ہو کر نیچے گر رہا تھا۔ میرے گھوڑے کے سموں سے پتھر
زمین ایک عجب خوش آہنگ انداز میں ایک خاص سے آہنگ کے ساتھ بج ر
تھی۔ اور میں نہ جانے کہاں جا رہا تھا میرا گھوڑا اسی رفتار سے دوڑتا رہا۔ دوڑتا
کہ اچانک پہاڑی کا موڑ آیا اور میں نے فائرنگ کی آواز سنی۔ جیسے تڑتڑ گولیا
چلنے لگی ہوں۔ میں نے لگامیں کھینچیں مگر گھوڑا نہ رکا۔ میں ابھی اسی سوچ میں
کہ اپنے پیچھے میں نے گھوڑوں کے سموں کی آواز سنی جیسے کئی گھوڑے بہت تیز
کے ساتھ بھاگتے ہوئے مجھ سے قریب ہوتے جا رہے ہوں۔ قریب اور بہ

ریب اچانک ایک فائر ہوا۔ شوں اوں۔ گولی میرے کان کے برابر سے نکل گئی
یرا گھوڑا بہت زور سے بدکا۔ دوسرا فائر ہوا اور مجھے ایسا لگا کہ ایک آگ کا خنجر سا
یرے بازو میں اتر گیا ہو میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اب گھوڑا بہت زور سے
کا۔ اور ایک دم اس نے زقندیں بھرنا شروع کر دیں۔ اب گھوڑا میرے قابو سے
ہر تھا میں نے اس کی لگامیں چھوڑ دیں اور اس کی گردن سے لپٹ گیا۔



فائرنگ کی آوازیں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔مگر گھوڑا اب بھی میرے قابو سے باہر تھا اور میں اسی طرح اس کی گردن سے چمٹا ہوا تھا۔گھوڑا اندھی طوفان کی طرح کس بنا معلوم سمت میں دوڑا چلا جا رہا تھا۔چاروں طرف اونچی نیچی چٹانوں کے ناہموار سلسلے بکھرے ہوئے تھے۔پتھریلی زمین گھوڑے کی ٹاپوں سے گونج رہی تھی۔تھوڑی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ گھوڑے کی رفتار کچھ کم ہو رہی ہے۔میں نے اس سے پہلے گھوڑے کی سواری کبھی نہیں کی تھی مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس نامعلوم جسم میں آتے ہی جس کا نام تک ابھی مجھے نہیں معلوم تھا مجھے ایسا لگا تھا کہ جیسے میں ہمیشہ سے یہ فن جانتا ہوں بالکل غیر محسوس طور پر میں نے اس کی باگیں تھام لیں اور اس کی گردن سے اپنی باہیں جدا کر لیں لیکن میں خود راستے سے ناواقف تھا۔مجھے کہاں جانا ہے اور یہ کون سی جگہ ہے جہاں اس وقت میں ہوں؟۔ میں اس بات سے بالکل لاعلم تھا سوائے اس کے کہ میں کنچنچنگا کی چوٹی سے چلا تھا۔اور اس کے بعد پرندے کے جسم میں نامعلوم کتنا سفر طے کرنے کے بعد میں

نے یہ جسم اپنایا تھا۔ اور نہ جانے کتنا سفر اس گھوڑے نے اپنی طوفانی رفتار سے اس
عرصے میں طے کرلیا تھا مجھے اس کی بھی کچھ خبر نہ تھی۔ گھوڑا اب بھی تیزی کے ساتھ
دوڑ رہا تھا میں نے دیکھا کہ وہ ایک تنگ سے درے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میرا
تجسس بڑھ گیا اور میں نے باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں کہ دیکھوں گھوڑا کدھر جا
ہے؟۔ گھوڑا تھوڑی ہی دیر بعد واقعی ایک تنگ سے درے میں داخل ہو گیا جس کے
دونوں طرف اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں۔ تھوڑی ہی دور چل کر گھوڑا ایک جگہ رک کر
ایک کنارے کھڑا ہوا۔ درہ بالکل سونا پڑا تھا۔ نہ یہاں آرام نہ آدم زاد۔ میں حیرت
سے اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میں اس وقت گھوڑے سے اترنے کے بارے
میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دم مجھے خیال آیا کہ اس جگہ یکہ وتنہا مجھے چھوڑ کر اگر گھوڑا
بھاگ لیا تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا تو پھر یہاں کھڑے رہ کر بھی کیا کیا جائے
یہ سوچ کر میں نے گھوڑے کو آگے بڑھانے کے لئے باگوں کو حرکت دی۔ مگر
گھوڑا ایک قدم آگے نہ بڑھا اور بجائے اس کے زور زور سے ہنہنا کر اپنا ایک اگلا
پیر ایک پتھر پر مارنے لگا گھوڑے نے اسی عمل کو کئی بار دہرایا۔ میں اس کی یہ حرکت
بغور دیکھتا رہا میں نے دل میں خیال کیا کہ ضرور گھوڑے کی اس حرکت کے کچھ نہ
کچھ معنی ہیں۔ مگر کافی انتظار کے بعد بھی کچھ ظاہر نہ ہوا۔ میں نے پھر ایک مرتبہ
کوشش کی کہ گھوڑا آگے بڑھے مگر گھوڑے نے اس مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ شدت
کے ساتھ ہنہنا کر اسی پتھر پر پیر مارا۔ مجبوراً میں گھوڑے سے اترا اور اس پتھر کو غور
سے دیکھنے لگا اس عرصے میں میں نے گھوڑے کی لگام نہیں چھوڑی میں نے جب

اس پتھر کو اور غور سے دیکھا مجھے ایسا لگا کہ یہ پتھر قدرتی نہیں بلکہ یہاں جمایا ہوا سا
معلوم ہوتا ہے وہ پتھر ایک [illegible] کی شکل میں کٹا ہوا تھا اور بظاہر ایسا لگتا تھا کہ
پہاڑی ہی کا حصہ ہے۔ میں اس پتھر کے دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ گھوڑے کی لگام
چھوڑ کر اس پر جھک گیا میں نے دیکھا کہ پتھر کے دائیں طرف ایک چھوٹا سا لوہے کا
گول کنڈل لگا ہوا ہے۔ میں نے یوں ہی اس کنڈل میں اپنی دو [illegible]
دیں اور اسے حرکت دینے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے جیسے ہی [illegible]
اسے اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ بہت زور کی گڑگڑاہٹ کی آواز ہوئی اور مجھے ایسا لگا
کہ میرے پاؤں کی زمین میرے نیچے سے کھسک رہی ہے۔ میں نے جلدی سے
گھبرا کر کنڈل سے اپنی انگلیاں نکالیں اور اس جگہ سے اچھل کر دور کھڑا ہو گیا۔ میں
نے دیکھا کہ کچھ دیر قبل جہاں میں کھڑا تھا اس کے بالکل داہنی طرف ایک بڑے غار
کا سا دہانہ نمودار ہو گیا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس میں جھانکنے کی کوشش کی
۔ مجھے اپنے کاندھے پر گرم گرم سانسیں محسوس ہوئیں میں نے پلٹ کر دیکھا تو گھوڑا
خود بخود میرے پاس چل کر آ گیا تھا۔ میں پھر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور چاہا کہ اس
چکر میں نہ پھنس کر کسی اور طرف نکل چلوں۔ نامعلوم اس غار میں کیا ہے؟۔ مگر جیسے
ہی میں گھوڑے پر سوار ہوا گھوڑا بلا جھجک اسی نیم تاریک سے غار میں داخل ہو گیا
اور آہستہ آہستہ دوڑنے لگا۔

پتا نہیں یہ غار تھا یا شیطان کی آنت ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ گھوڑا
دوڑتا رہا اور میں اس کے رحم و کرم پر باگیں ڈھیلی کیے ہوئے اس پر سواری کرتا رہا

۔ یہاں تک کہ مجھے کچھ روشنی کا سا احساس ہوا۔ ہاں وہ روشنی ہی تھی۔ غار میں او
روشنی؟ مگر یہ کسی بلب یا لالٹین کی روشنی نہیں تھی دن کی روشنی تھی۔ میں اب بالکل
روشنی میں تھا اور سامنے دور تک مجھے چھوٹی بڑی جھونپڑیاں دور تک دکھائی دے رہی
تھیں۔ یہ حصہ بالکل کنواں سا تھا گول چاروں طرف بڑی بڑی پہاڑیاں دکھائی
دے رہی تھیں جو ایک دوسرے سے بالکل ملی ہوئی تھیں ان کے درمیان بظاہر کوئی
راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پہاڑیوں سے گھری ہوئی پیالہ نما سی یہ وادی بڑی سرسبز
شاداب نظر آ رہی تھی۔ دور تک پھیلی ہوئی ہریالی آنکھوں کو بہت بھلی لگ رہی تھی او
ان کے درمیان چھوٹے بڑے جھونپڑے بھی بہت حسین دکھائی دے رہے تھے
۔ سورج غروب ہونے کو تھا جنگلی پھولوں پر ناچتی ہوئی سورج کی نہری کرنوں کی
جالیاں مجھ سے قریب آ گئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ میرے گھوڑے کی ٹاپوں کی
آواز سے جیسے ان جھونپڑیوں میں زندگی آ گئی ہو۔ ہر جھونپڑے سے عورتیں بچے
اور بوڑھے نکل رہے تھے میں ان کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اور وہ سب چیخ چیخ کر نہ
معلوم مجھ سے کیا پوچھتے رہے۔ ہاں ایک لفظ بار بار میرے کانوں سے ٹکرا رہا تھا
۔ ''سردار' سردار'' اس وقت میرا گھوڑا جھونپڑوں کے درمیان دوڑ رہا تھا بچے'
بوڑھے اور عورتیں دو طرفہ کھڑے ہوئے ہاتھ ہلا ہلا کر نہ جانے کیا کیا کہہ رہے
تھے۔

سردار۔؟۔ یہ سردار کون ہے میں نے سوچا۔ تو کیا یہ کوئی قبیلہ ہے جس کا
سردار یہ جسم ہے جس میں اس وقت میں ہوں؟۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ گھوڑا

ایک بڑے جھونپڑے کے سامنے رکا۔ اس کے دروازے پر ایک سفید ریش بوڑھا
اور ایک بوڑھی عورت کے علاوہ ایک نہایت حسین لڑکی بھی کھڑی تھی جس کی عمر
شکل سے سولہ سترہ سال ہوگی میرے گھوڑے کے رکتے ہی وہ بڑی بڑی نشیلی
آنکھوں والی لڑکی سب سے پہلے بھاگ کر میرے گھوڑے کے قریب آ گئی اور مجھے
گھوڑے سے اترنے میں مدد دینے لگی۔ میں جیسے ہی گھوڑے سے اترا اس نے چیخ
کر کہا بھیا! میں پہلے ہی منع کر رہی تھی کہ آج نہ جاؤ مگر تم نے مانے۔ ماں یہ دکھو بھیا
کے ہاتھ پر خون جما ہوا ہے۔'' اس لڑکی نے جسے ماں کہہ کر پکارا تھا وہ بوڑھی
عورت گھبرا کر آگے بڑھی اور میرا چاند'' کہتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ بوڑھے کی
کڑک دار آواز گونجی۔ ''رنجیت کی ماں۔ ہٹو!۔ چلو جلدی اسے اندر لے چلو اور
مرہم پٹی کرو! اے شوبھا! پانی گرم کر' میں اس عرصے میں اپنے بازو کی تکلیف کو
بالکل بھول ہی چکا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ جس وقت میرا گھوڑا بدک کر بھاگا تھا ایک
گولی سنسناتی ہوئی میرے بازو کو چھو کر گزر گئی تھی میں گھوڑے سے اتر کر اندر
جھونپڑے میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ پیچھے سے ایک شور سنائی دیا میں نے مڑ کر
دیکھا تو بہت سے بوڑھے' عورتیں' لڑکیاں اور بچے جھونپڑے کے سامنے جمع ہو
گئے تھے۔ سفید ریش بوڑھے نے جو جھونپڑے میں داخل ہو چکا تھا ایک دم باہر نکل
کر اپنی گونج دار آواز میں ان سب کو مخاطب کیا'' ابھی چلے جاؤ۔ سردار زخمی ہے'
تھوڑی دیر بعد تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔'' بوڑھے کی آواز سن کر تمام مجمع
چھٹ گیا اور بوڑھا میرے کندے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اندر لے گیا۔

وہ جھونپڑا اندر سے کافی کشادہ تھا جگہ جگہ جانوروں کی کھالیں بچھی ہو
تھیں اور ایک طرف پیالی کا بہت نرم و گداز بستر بچھا ہوا تھا جس پر مجھے لٹا دیا گیا ا
کچھ دیر بعد وہ نشیلی اور بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی جس کو بوڑھے نے شوبھا کہہ
پکارا تھا گرم پانی لے آئی اور میرے ہاتھ کا زخم دھونے لگی۔ سفید ریش بوڑھا سا
ایک تخت پر بیٹھا میری بندوق صاف کر رہا تھا اور بوڑھی عورت بڑے جھونپڑے
کے دوسرے حصے میں چلی گئی تھی۔ میری مرہم پٹی ہوگئی۔ شوبھا نے خود میرے
جوتے کے بند کھولے اور انہیں اتار کر ایک طرف رکھ دیا اتنے میں بوڑھی عور
گرم گرم دودھ کا ایک پیالہ لے کر آ گئی اور میں نے اٹھ کر پیالہ اس کے ہاتھ سے
لے کر ہونٹوں سے لگایا۔ بوڑھا اس عرصے میں بندوق صاف کر کے ایک کھونٹی
لٹکا چکا تھا وہ میرے بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔ اور میرے نرم نرم بالوں پر ہاتھ پھیر کر میر
آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بولا ''ہاں بیٹے اب بتاؤ معرکہ کیسا رہا' اور باقی
لوگ کہاں رہ گئے؟'' میں یہ سن کر ایک لمحے کے لئے چکرا سا گیا کیسا معرکہ او
کیسے باقی لوگ؟ کیا میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے؟ ممکن ہے رہے ہوں مگر میں
اس بات سے قطعی ناواقف تھا۔

میں نے غور سے بوڑھے کی آنکھوں میں دیکھا اور مجھے ایک خفیف سا
جھٹکا لگا یہی کیفیت بوڑھے کی ہوئی اب وہ صرف کھوئی کھوئی نظروں سے میری
آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھا تھا میں نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے میں اس بوڑھے
کا ذہن پڑھ سکتا ہوں میں نے اس کا ذہن پڑھنا شروع کر دیا ہوں۔ تو بوڑھا اس

وقت یہ سوچ رہا تھا کہ اس کے بیٹے رنجیت سنگھ کی جھڑپ یقیناً پولیس سے ہوگئی ہے
جس کے نتیجے میں وہ زخمی ہوگیا ہے اور اپنی جان بچا کر کسی طرح اپنے ٹھکانے تک
آ گیا ہے۔ میں پڑھتا رہا۔ تو میں اس وقت جس جسم میں ہوں اس کا باپ یہ بوڑھا ہے
اور اس جسم کا نام رنجیت سنگھ ہے جو اس سفید ریش بوڑھے کے بعد اس گروہ کا سردار
بن گیا ہے یا بنا دیا گیا ہے۔ اس بستی میں تقریباً سو سوا سو گھر ہیں اور تقریباً **200** یا
250 مرد ہیں جوان۔ یہ ایک ڈاکوؤں کا منظم گروہ ہے میں اس کا ذہن پڑھتا رہا۔
تو ڈاکو رنجیت سنگھ ہوں میں۔ خوب! میں نے پہلے بھی کچھ دن ہوئے یہ نام سنا تھا۔
مگر وہ تو مر چکا تھا۔ پھر۔ یہ کیا معمہ ہے۔'' اخباروں میں تو بڑی بڑی سرخی لگی تھی کہ
مشہور ڈاکو ٹھاکر رنجیت سنگھ کو پھانسی دے دی گئی تو یہ کون رنجیت سنگھ ہے؟۔ بس
اپنے خیالوں میں اتنا محو ہوا کہ میری توجہ بوڑھے سے ہٹ گئی اور اچانک مجھے اور
بوڑھے دونو کو ایک جھٹکا سا لگا۔ بوڑھا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا اور بولا۔ مجھے
کیا ہو گیا تھا؟ رنجیت! کیا میں بے ہوش ہو گیا تھا؟ میں نے کہا ''نہیں تو پتا جی''
بوڑھا بولا ''پتا جی؟'' یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ تو تو مجھے بابا کہتا ہے۔ میں نے جلدی سے
سنبھل کر کہا ''ہاں بابا' بابا''۔

''میں تجھ سے پوچھ رہا تھا بیٹے کہ معرکہ کیسا رہا؟ کیا ہمارے کچھ لوگ
مارے گئے اور بقیہ لوگ کہاں رہ گئے؟۔ بوڑھے نے کہا۔ میں ابھی کچھ جواب
دینے کی سوچ ہی رہا تھا کہ جھونپڑے سے باہر مجھے پھر ایک شور سا سنائی دیا مگر یہ شور
گھوڑوں کی ٹاپوں کا تھا۔

چار پانچ نوجوان تقریباً بھاگتے ہوئے جھونپڑے میں داخل ہوئے ا
ان میں سے ایک آگے بڑھا اور مجھے دیکھ کر بولا سردار بھگوان کی دیا سے آپ
گئے ۔ یہ جان کر میں بہت خوش ہوں ہم سب تو آپ کے نہ ہونے سے ڈر رہی
تھے ۔مگر رام سروپ نے آپ کے گھوڑے کو ایک سمت بھاگتے ہوئے دیکھ لیا
۔ہم نے سوچا کہ آپ یقیناً بچ کر نکل گئے ۔ یہ کہہ کر وہ نوجوان سر جھکا کر خامو
کھڑا ہو گیا ۔اتنا سنتا تھا کہ بوڑھا سفید ریش غضبناک ہو کر ایک دم اٹھا اور چیخ
مجھ سے کہا رنجیتے ! یہ کیا؟ ۔آج تک ایسا نہیں ہوا؟ ۔تو نے یہ کیا کیا' جواب د
تو نے میدان کو پیٹھ کیوں دکھائی ۔؟ تو کیوں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر اس طر
بھاگ آیا؟ بول! ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گا میں نے اپنی پوری زندگی سردار
کی ۔ تیرے دادا ٹھاکر پرتاب سنگھ نے پوری زندگی سرداری کی مگر کبھی آج ا
ساتھیوں کو چھوڑ کر اس طرح نہیں بھاگے اور نہ تو نے اب سے پہلے ایسا کیا جوا
دے کیا تیرے بدن میں ہمارا خون نہیں ۔؟ بول خاموش کیوں ہے ۔؟ بوڑھا گر
رہا بوڑھے کی بات سن کر پیچھے کھڑا ہوا ایک نوجوان آگے بڑا ۔اور بولا ۔ بڑے ٹھا
اس میں سردار کا کوئی دوش نہیں پولیس نے اچانک ہم پر حملہ کیا اور ہم سب تتر ب
ہو گئے میں نے خود اپنی آنکھوں سے سردار کو فائرنگ کرتے دیکھا ہے ۔مگر ایک
مرتبہ ان کا گھوڑا بہت زور سے بدک گیا اور قابو سے باہر ہو گیا ۔اور سردار اس
گردن سے لپٹ گئے اور وہ انہیں یہاں لے آیا ۔اس میں سردار کا کیا قصور؟
بوڑھا اس نوجوان کی بات سن کر تھوڑا ٹھنڈا پڑا مگر ذرا خفگی سے بولا ۔رام سروپ

ٹھیک کہتا ہے مگر کیا تمہارے سردار کو اب دوبارہ مجھے گھوڑے کی سواری سکھانی پڑے
گی' کیا یہ ایک گھوڑے کو بس میں نہیں کر سکتا تھا؟ ۔ہم نے سینکڑوں منہ زور گھوڑے
سیدھے کر دیئے اور ہمیں تو اس کی گھڑسواری پر ناز تھا پھر اسے کیا ہو گیا تھا ۔اس پر
آگے کھڑا ہوا نوجوان بولا ۔ وقت وقت کی بات ہے بڑے ٹھاکر کبھی کبھی ایسا بھی ہو
جاتا ہے ۔'' وہ سفید ریش بوڑھا ایک لمحے کے لئے کچھ کہتے کہتے رکا اور پھر اس
نوجوان سے مخاطب ہو کر بولا ۔'' میری سمجھ میں نہیں آتا اجیت کو پولیس کو کس طرح
ہمارے اس ڈاکے کی اطلاع مل گئی ۔ یقیناً کسی نے مخبری کی ہے آج کوئی دس سال
بعد شاید یہ پہلا ڈاکا ہے جو تم لوگ ناکام لوٹے ہو اور پہلے ہی سی پولیس کو تمہاری خبر
لگ گئی ۔ضرور کچھ گڑ بڑ ہوئی ہے ۔'' میں اس عرصے میں اٹھ کر ٹہلنے لگا تھا اور پیچھے
کھڑے ہوئے جوانوں کو دیکھ رہا تھا ۔اس میں سے ایک کے چہرے پر پسینے کے
قطرے سے چمکنے لگے ۔اور وہ کچھ گھبرایا گھبرایا سا دکھائی دینے لگا میں نے اس کی
آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور ایک جھٹکے کے ساتھ مجھے پھر ایسا لگا کہ جیسے اس کا
ذہن میرے لئے کھلی کتاب ہے ۔ میں نے اپنے ذہن میں سوال کیا کون ہے یہ ۔؟
مجھے اس کا جواب فوراً مل گیا میرا نام کرتار ہے ۔ ہوں تو اب میں ذہنوں سے سوال
بھی کر سکتا ہوں میں نے اس کا ذہن ٹٹولنا شروع کر دیا وہ اس وقت سوچ رہا تھا کہ
بھگوان کسی طرح یہ نہ پتا چل جائے کہ میں نے پولیس کو مخبری کی ہے ورنہ یہ لوگ مار
ڈالیں گے مجھے اور بیس ہزار کا انعام جو سردار کے زندہ یا مردہ پکڑوانے پر حکومت
نے مقرر کیا ہے اس سے محروم ہو جاؤں گا ۔ ہوں تو یہ ہے وہ شخص جس نے پولیس

سے مخبری کی ہے۔ مجھے جواب ملا۔ ہاں میں نے سوال کیا۔ تم کب اس گروہ
داخل ہوئے؟۔ جواب ملا ایک سال پہلے۔ میں نے پھر اسے ذہن میں سو
پوچھا۔ تمہیں یہاں کون لایا۔ جواب آیا۔ خود سردار رنجیت سنگھ میں انہیں ان
پہاڑیوں میں بھٹکتا ہوا ملا تھا۔ اور میں نے سردار سے کہا تھا کہ میں خونی ہوں،
نے کئی قتل کیئے ہیں اور جیل سے بھاگ کر آیا ہوں، میرے جسم پر اس وقت قیدیو
کے کپڑے تھے اور پاؤں میں بیڑیوں کے کٹے ہوئے کڑے پڑے ہوئے تھے
سردار مجھے یہاں لے آئے چھ مہینے مجھے یہاں سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ملی۔
آخر کار ایک دن سردار نے مجھے ایک ڈاکے میں اپنے ساتھ لے لیا میں نے سر
کے ساتھ اس کے بعد کئی ڈاکوؤں میں نہایت بہادری کے ساتھ کئی لوگوں کو قتل
۔سردار کا اعتبار مجھ پر بڑھ گیا اور اب مجھے اکیلے بھی باہر آنے جانے کی اجازت
گئی۔ یہ اجازت مجھے ابھی ایک مہینا ہوا ملی تھی اس مرتبہ میں نے موقعہ پا کر پولیس
اس کی اطلاع دے دی کہ فلاں دن فلاں راستے سے مشہور ڈاکو رنجیت گزرے گا
مجھے خود پولیس نے یہاں بھیجا تھا اور جیل کے کپڑے وغیرہ بھی فراہم کیئے تھے
لئے انہوں نے مجھے گرفتار نہیں کیا اور کہا کہ تم واپس جاؤ۔ اگر بھگوان نہ کرے
حملہ ناکام ہو تو آئندہ تم پھر ہمیں اطلاع دے سکو۔ میں نے ان کے لاکھ پوچھنے
بھی ٹھکانے کا پتا نہیں بتایا''۔ میں نے پھر سوال کیا۔

آخر کیوں۔؟ تم نے انہیں یہاں کا پتا کیوں نہیں بتایا اس میں کیا مصلحت
تھی۔؟ اور پھر انہوں نے تم سے پتا پوچھا کیوں نہیں۔؟۔ مجھے جواب ملا'' میں

ن میں جھوٹ بول دیا اور کہا کہ ابھی کیونکہ انہیں میرے اوپر پورا اعتماد نہیں اس
لئے ایک خاص جگہ کے بعد میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے۔ اور پھر وہاں
ے مجھے کوئی اور شخص گھوڑے پر بٹھا کر لے جاتا ہے۔ میں نے ایسا اس لئے کیا کہ
ں نے سن لیا تھا کہ ان کا ارادہ یہ تھا کہ اس جگہ کو بمباری کر کے بالکل ختم کر دیا
ائے اور میں ایسا کسی قیمت پر نہیں چاہتا تھا۔ کسی قیمت پر نہیں ہرگز نہیں۔ میں نے
ھرا اپنے ذہن میں سوال ''کیوں''۔ تم ایسا کیوں نہیں چاہتے تھے جواب دو۔ اس کا
واب تھا۔ اس طرح۔ اس طرح اگر وہ تمام وادی کو بم سے اڑا دیتے تو.........تو
ں میں سردار کی بہن شوبھا ماری جاتی جس سے مجھے بے انتہا محبت ہو گئی ہے اور وہ
ی مجھے بہت چاہتی ہے بہت۔؟۔ میں اسے کسی طرح نہیں چھوڑ سکتا تھا میں نے
وچ لیا تھا کہ ہم اور شوبھا یہاں سے بھاگ کر کہیں دور چلے جائیں گے دور بہت
ر جہاں یہ گھناؤنی زندگی نہ ہو۔ قتل وغارت گری اور ڈکیتی نہ ہو۔ اس کا اظہار
بھا سے بھی کر چکا ہوں اور وہ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہے۔ اور بار بار تقاضا کرتی
۔ میں اسے ٹال دیتا ہوں۔ مجھے انتظار اس وقت کا ہے جب میں ڈاکو رنجیت سنگھ کو
ہ یا مردہ پکڑوا دوں اور مجھے بس ہزار روپے مل جائیں تو میں اور شوبھا کہیں کسی
بلہ جا کر سکھ چین کی زندگی گزار سکیں۔'' اچانک میرے کانوں میں بہت زور کی
از آئی اور میں چونک پڑا یہ آواز بوڑھے کی تھی۔ رنجیتے!۔ کیا گم صم کھڑا ہے۔
ے کچھ ساتھیوں کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے اور ابھی وہ جیل میں پہنچے بلکہ تھانہ
وال ہی میں قید ہیں۔ ان کے لئے کچھ سوچنا ہے مگر تو تو ایسا ٹس ہوا ہے کہ کچھ

بولتا ہی نہیں۔ یہ آج کیا ہوگیا ہے تجھے؟۔ یہ آواز سن کر میں مڑا میرے اور کر
کے جسموں کو جھٹکا سالا میں نے کرتار کی آنکھوں سے اپنی آنکھیں ہٹالی تھیں۔

میں نے پلٹ کر ایک نظر سب کو دیکھا۔ شوبھا سامنے کھڑی ہوئی بڑی بڑی
نظروں سے کرتار کر دیکھ رہی تھی۔ میں نے رام سروپ اور دوسروں لوگوں
اچانک پلٹ کر کہا۔ ''رام سروپ'' کرتار کو پکڑ لو۔ اور فوراً اور اسے باندھ کر ڈال
۔ یہ سنتے ہی جیسے کرتار پر بجلی گر گئی۔ اس نے بندوق پر ہاتھ ڈالنا چاہا مگر اس کے
پاس کھڑے ہوئے جوان اس پر ٹوٹ پڑے اور اسکی بندوق چھین کر اس کی مشک
کس دیں۔ یہ دیکھ کر شوبھا چیخی۔ بھیا! یہ تو نے کیا کیا۔؟ میں کڑک کر بو
خاموش رہ! اور شرم کر۔ میری بھول کا انجام میرے سامنے ہے۔ اس نے اس کر
نے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک دی اور ساتھ ساتھ تیری آنکھوں میں بھ
کیا تو اپنے بھیا کے خون سے اپنے سہرے کے پھول کھلانا چاہتی تھی۔؟۔ کیا تیر
جھوٹے پیار کی قیمت تیرے بھائی کا سر ہے۔ جواب دے۔ کیا تو اس بزدل
پولیس کے مخبر کے ساتھ بھاگنا چاہتی تھی۔ بول۔ رنجیتے۔ کیا بک رہا ہے؟۔ بو
سفید ریش یہ سن کر زور سے دھاڑا۔ اپنی زبان کو لگام دے تو اپنی سگی بہن پر الزا
رہا ہے تو۔ کہیں پاگل تو نہیں ہوگیا؟۔ میں نے غیر جذباتی آواز میں کہا نہیں
! میں پاگل نہیں ہوا۔ خود یہ سب کچھ قبول دیگا۔ شوبھا سسکیاں بھرنے لگی اور
بھیا' بھیا یہ کبھی نہیں ہوسکتا کرتار ایسا نہیں کرسکتا کبھی نہیں۔ بول نہ کرتار ے۔
دے نا کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے کہ تو نے پولیس کی مخبری کی ہے بولتا کیوں نہ

بوڑھا بولا۔

شوبھا۔ تو اندر جا۔ ہم ابھی سب معلوم کیئے لیتے ہیں رام سروپ ! میرا
ہنٹر لاؤ۔ میں اس کی کھال گرا دوں گا۔ مار مار کر اس کا بدن ادھیڑ دوں گا۔۔۔
شوبھا روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ اب بوڑھے کے ہاتھ میں ایک پانی کا بھیگا ہوا
ہنٹر تھا۔ اس نے جیسے ہی ہنٹر گھمایا۔ کرتار چیخا۔

''نہیں نہیں مجھے مت مارو مت۔ میں سب کچھ بتا دوں گا سب کچھ۔
سردار صحیح کہتا ہے بالکل سچ۔ مگر۔ مگر ہمارا پیار اجھوٹا نہیں۔ میں نے۔ میں نے شوبھا
سے سچی محبت کی ہے بالکل سچی اور اب مجھے پیسے کا لالچ بھی نہیں میں شوبھا کے لئے
اب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ اپنے ماں باپ' اپنی پچھلی زندگی' سب کچھ' مگر مجھے مارو
مت۔''

یہ سن کر بوڑھے کا اٹھا ہوا ہاتھ بے دلی کے ساتھ کوڑ کے نیچے آ گیا۔ اور وہ
ہانپتا ہوا پیال کے بستر پر گر گیا۔ باقی تمام لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا رام سروپ
نے اس خاموشی کو توڑا۔ سردار۔ مبارک ہو۔ آج آپ نے کمال کر دیا ہمیں تو اس
پر دور تک شک نہیں تھا پھر یہ آپ کا چہیتا بھی تھا۔ ہم کیا کہتے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں
مخبر کی سزا سوائے موت کے کچھ نہیں۔ اب آپ چاہیں تو ہم اسے اسی وقت گولی
مار دیں یا نہیں۔ بوڑھا چیخا۔ اسے کل بڑے میدان میں سب کے سامنے میں گولی
ماروں گا میں۔ اس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ تا کہ بستی کے باقی لوگوں کو
عبرت ہو کہ مخبر کا انجام کیا ہوتا ہے۔'' بابا۔ بابا رحم'' یہ شوبھا تھی جو روتی ہوئی بوڑھے

کے پیروں سے لپٹ گئی تھی۔ ''اب وہ ایسا نہیں کرے گا کبھی نہیں اسے معاف دو۔'' بوڑھا کڑک کر بولا۔تو۔تو یہ چاہتی ہے کہ میں اپنے گھر میں سانپ پالو نہیں ہرگز نہیں۔ اگر تو نے کچھ کہا تو میں تجھے بھی گولی مار دوں گا۔شوبھا کی ما اسے لے جاؤ میرے سامنے سے میری آنکھوں میں خون اتر رہا ہے'' یہ سن کر بوڑ افسردہ عورت آگے بڑھی اور اپنی بیٹی کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا'' اور اندر لے گئی۔

رام سروپ پھر بولا۔تو سروار کیا حکم ہے۔ہم نے پولیس کے دس آد زندہ پکڑ لئے ہیں اور ہمارے پانچ آدمی ان کی قید میں ہیں کیا کیا جائے؟ کیا آ رات شب خون مار دیا جائے؟۔

''نہیں۔'' بوڑھا بولا۔ان دس میں سے پانچ کو گولی مار دو اور ان لاشیں آج ہی رات گڑوال میں پہنچا دو کسی بھی طرح اور ساتھ ساتھ یہ خط بھی لکھ ان لاشوں کے ساتھ پہنچا دو کہ اگر ہمارے پانچ آدمی صبح تک نہ چھوڑے گئے تو بق پانچ سپاہیوں کی لاشیں بھی کل رات تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔ یہ کام آج رات ہونا چاہئے۔اور سنو یہ بھی لکھ دو کہ اگر ہمارے ان آدمیوں کا پیچھا کیا گیا بھی ہم بقیہ پانچ سپاہیوں کو گولی مارے بغیر نہیں چھوڑیں گے اور کل صبح سے پ تھانہ گڑوال سے یہاں تک پہاڑیوں میں اپنے آدمیوں کا جال بچھا دو اگر کسی کو ان پانچوں کے پیچھے آتا دیکھو تو بے کھٹکے بھون دو۔بوڑھے نے میری طرف مڑ کر تمہارا کیا خیال ہے رنجیتے!۔؟۔ بالکل صحیح مشورہ ہے بابا ایسا ہی ہونا چاہئے۔ا اس مہم کو رام سروپ سر کرے گا۔'' میں نے کہا۔بوڑھا بولا۔نہیں تم سردار ہو یہ کا

تمہارا ہے تم تھانہ گڑوال کے راستے سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔اور خفیہ راستوں سے بھی۔پولیس کا معاملہ ہے میں رام سروپ کو اکیلا بھیجنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔میں نے کہا۔مگر بابا اسکے ساتھ...... بوڑھا بولا۔ٹھیک ہے اس کے ساتھ اور بھی جوان ہونگے مگر تمہارا ہونا بہت ضروری ہے۔رام سروپ! تم قید خانے سے پانچ سپاہی لے آؤ۔ بہت دن ہو گئے کیا پتا میرا نشانہ کیا ہے؟ بہت دن ہو گئے گولی چلائے۔آج نشانے بازی ہی ہو جائے ویسے بھی آج مجھ پر خون سوار ہے اس طرح کم از کم کچھ دل کی بھڑاس ہی نکلے گی۔جاؤ اور ابھی پانچ سپاہیوں کو لے کر میدان میں آ جاؤ اور بستی میں خبر کر دو کہ آج بڑے ٹھاکر نشانے بازی کریں گے۔ جاؤ! اور سنو۔اسے بھی لے جاؤ۔اس بزدل کرتار کو۔۔ یہ سن کر دونو جوانوں نے کرتار کو اٹھایا ۔ پھر رام سروپ اور اس کے ساتھی جھونپڑے سے نکل گئے اور بوڑھا بندوق لوڈ کرنے لگا۔اندر سے ابھی بھی سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں میں اندر جھونپڑے کے دوسرے حصے میں چلا گیا بوڑھی عورت افسردہ سی ایک پیڑھی پر بیٹھی لالٹین کی چمنی صاف کر رہی تھی اور شوبھا ایک پیال کے بستر پر اوندھی پڑی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔

میں شوبھا کے قریب گیا۔وہ مجھے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی اس کی نشیلی آنکھیں سرخ ہو کر اور بھی حسین لگ رہی تھیں اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر مجھے بستر پر گھسیٹ لیا اور رونے لگی۔ بھیا مجھے معاف کر دو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مخبر ہے مگر بھیا۔اب وہ ایسا نہیں کرے گا میں تجھے یقین دلاتی ہوں اب وہ بالکل بدل

جائے گا تو اسے بھی معاف کر دے بھیا۔ یہ سن کر بوڑھی عورت وہیں بیٹھی بیٹھی
چیخی ''لڑکی۔ تو ٹھاکر کی اولاد ہے یا کسی بزدل کی۔ شرم کر۔ اس بزدل کمینے نے
تیرے بھائی کے سر کی قیمت وصول کرنا چاہتی اور تو اس کے لئے رحم کی بھیک مانگ
رہی ہے۔ تو ہوتے ہی کیوں نہ مرگئی شوبھا! جو مجھے یہ دن دیکھنا پڑا۔ یہ کہہ کر بوڑھی
عورت رونے لگی۔ میں اب بوڑھیا کے قریب گیا اور اسے دلاسا دینے لگا'' مت رو
ماں یہ ابھی بچی ہے نا سمجھ ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں سب کچھ آجائے گا'' میں
ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ جھونپڑے کے دوسرے حصے میں رام سروپ کی آواز سنائی
دی۔ جو کہہ رہا تھا'' بڑے ٹھاکر ہم کرتار کو قید خانے میں ڈال آئے ہیں اور پانچ
سپاہی ہم نے لاکر بڑے میدان کے ستونوں سے باندھ دیئے ہیں۔ تمام بستی کے
لوگ جمع ہو گئے آپ کا انتظار ہے چلئے!'' یہ سن کر بوڑھے کے اٹھنے کی آواز سنائی
دی اور اس نے زور سے کہا۔ رنجیتے۔ تو نہیں چلے گا۔ ہماری نشانے بازی دیکھنے؟
میں یہ سن کر باہر آیا اور ساتھ ساتھ بوڑھی عورت بھی۔ بوڑھے نے کڑک کر کہا
شوبھا کہاں ہے؟ وہ بھی ہمارے ساتھ چلے گی۔ بوڑھی اندر گئی اب اس کے ساتھ
شوبھا بھی تھی۔ بوڑھے نے اسے دیکھ کر کہا۔ اپنی صورت دیکھ! منہ بالکل بلیوں
سا چاٹا ہو رہا ہے۔ جلدی سے ہاتھ منہ دھو اور ہوش میں آجا ورنہ چھٹے ستون سے
تجھے بھی بندھوا کر گولی سے اڑا دوں گا۔ بوڑھے کی بات سن کر شوبھا سہم گئی اور جلدی
سے منہ دھو کر آ گئی ہم سب باہر آئے سورج پوری طرح غروب ہو چکا تھا اور تمام
بستی میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل گیا تھا جسے ذرا ذرا سے فاصلے پر لگی ہوئی مشعلیں دور

کر رہی تھیں تمام بستی کے باہر مشعلیں روشن تھیں۔ جو بڑی عجیب سی لگ رہی تھیں
جھونپڑے کے باہر پانچ چھ گھوڑے کھڑے تھے جن میں سے ایک پر ہم سب بیٹھ
گئے بڑے ٹھاکر کا گھوڑا آگے تھا جیسے ہی ہم سب گھوڑوں پر بیٹھے ایک شخص نے
جس کا جھونپڑا ہمارے برابر ہی تھا۔ ہم سب کے ہاتھ میں ایک ایک مشعل تھما دی
اور یہ عجیب وغریب قافلہ آگے بڑھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت بستی کے سب
جھونپڑے خالی پڑے ہیں۔ کہیں دور سے دھیمے دھیمے شور کی سی آوازیں آرہی تھیں
گھوڑے پتھریلی زمین پر اسی شور کی سمت بڑھنے لگے۔

یہ ایک بہت بڑا میدان سا تھا بالکل گول سا جس کے ایک طرف پیچھے کی
سمت پہاڑی تھی جس کے سامنے درجنوں ستون نیم دائرے کی شکل میں بنے ہوئے
تھے۔ اس وقت دور سے ان ستونوں میں سے پانچ پر مشعلیں روشن تھیں۔ ہم اور
قریب پہنچ گئے ان ستونوں سے کوئی سو گز کے فاصلے پر سامنے ایک بڑا مجمع تھا۔ جس
میں بچے۔ بوڑھے' جوان' عورتیں' لڑکیاں سبھی تھے اور قریب قریب سب کے
ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ میدان' ان مشعلوں سے پوری طرح جگمگا رہا تھا قریب
پہنچنے پر اس مجمع نے نعرے لگائے۔ سردار رنجیت سنگھ کی جے بڑے ٹھاکر کی جے
اور ہم ان نعروں کی گونج میں اس بڑے چبوترے تک پہنچے جس پر ہرن کی کھالیں
بچھی ہوئی تھیں اور جس کے دونوں طرف مجمع تھا۔ مجھے اس مجمع کو دیکھ کر ایک عجیب
وحشت کا سا احساس ہوا اور جی چاہا کہ کسی طرح یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر
نعرے سن کر دل میں ایک عجیب سی بڑائی پیدا ہوئی۔ اور میں چبوترے کی سیڑھیاں

چڑھنے لگا۔

اب ہم سب چبوترے پر تھے۔اور مجمع نعرے لگا رہا تھا۔ہم سے کوئی
کے فاصلے پر ستونوں سے جن کے ساتھ مشعلیں روشن تھیں وہ پانچ بدنصیب
بندھے ہوئے تھے۔ بوڑھا سفید ریش چبوترے پر کھڑا ہوا۔ اور تقریر شر
کی۔''میرے بیٹو اور بیٹیو اور بزرگو! آج کوئی دس سال بعد ایسا موقعہ پیش آیا
کہ ہمارے پانچ بہادر جوان زخمی حالت میں پولیس کے ہاتھ لگ گئے ہیں
کیوں ہوا؟ ہمارے بیچ پولیس کا مخبر تھا جسے آج ہی تمہارے سردار نے پہچان لیا
اور اسے قید کر دیا گیا ہے یہ بزدل کرتا رتھا۔ بوڑھے نے اتنا ہی کہا تھا کہ مجمع
ایک شور اٹھا۔مخبر کو گولی مارو اسے بھی یہاں لاؤ۔ اسے بھی گولی مارو۔'' یہ س
بوڑھے نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش کیا اور پھر اپنی تقریر شروع کی
تم لوگ صحیح کہتے ہو مخبر کی سزا ہمارے قانون میں گولی ہے۔ایسا ہی ہوگا۔مگر ا
اس سے کچھ پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔کل صبح اسی میدان میں! خود اسے گولی ماروں
تم لوگ مطمئن رہو۔ یہ سن کر مجمع خاموش ہو گیا بوڑھے نے پھر لونا شروع ک
ہمارے پانچ آدمی ان کی قید میں ہیں اور دو آدمی پولیس سے مقابلہ کرتے ہو
مارے گئے ہیں ان کے بچوں کی دیکھ بھال اور گزر بسر کی ذمہ داری ہم پر ہے۔
ہم اسے پورا کریں گے ہم نے اپنے آدمیوں کی پولیس سے رہائی کے لئے
ترکیب سوچی ہے کہ ان کے دس سپاہی زندہ ہمارے پاس ہیں جن میں سے پا
تمہارے سامنے ستونوں سے بندھے ہوئے اپنی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔آ

تمہارا سردار اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ ان کی لاشیں رات ہی میں لے
تھانہ گڑوال جائے گا اور انہیں وہاں چھوڑ کر آ جائے گا اور اس کے ساتھ ہی یہ خط
بھی پولیس کے نام ان کی لاشوں کے ساتھ چھوڑ آئے گا۔اگر ہمارے آدمی صبح تک
رہا نہ کیے گئے تو کل رات بقیہ پانچ کی لاشیں بھی پولیس کو پہنچا دی جائیں گی۔اب
تم لوگ بتاؤ کیا تمہیں یہ ترکیب منظور ہے؟''۔ مجمع نے یک زبان ہو کر کہا ''ہمیں
منظور ہے بڑے ٹھاکر کی جے۔نعروں کی گونج میں بڑے ٹھاکر نے اپنی تقریر ختم کی
اور آخر میں کہا۔''اگر اس پر بھی پولیس نے ہماری آدمی نہ چھوڑے تو ہم زبردستی
تھانے پر حملہ کر کے انہیں چھڑا لیں گے''۔ ایک بار پھر بڑے ٹھاکر کی جے کار
ہوئی۔ پھر بڑے ٹھاکر نے بندوق لوڈ کر کے کہا۔اب تم دیکھو کہ تمہارے بڑے
ٹھاکر کا نشانہ کتنا سچا ہے۔اور اس کے ساتھ ہی بڑے ٹھاکر نے پے در پے دو فائر
کیے اور سامنے سے دو جگر خراش چیخیں سنائی دیں۔پھر بڑے ٹھاکر نے بندوق لوڈ کی
مجمع خوشی سے پھر نعرے لگانے لگا۔ کیے بعد دیگرے نعروں کی گونج میں تین فائر
اور ہوئے اور تین چیخیں مزید میدان کے شور میں شامل ہو گئیں۔



وہ ایک ایسا ہی مجمع تھا کہ وحشت و بربریت کے مظاہرے پر خوشی سے تالیاں بجا رہا تھا جب ان پانچ سپاہیوں کی لاشیں ستون سے کھول کر گھسیٹتے ہوئے مجمع کے سامنے لائی گئیں تو ان کے چہرے گلابوں کی طرح کھل گئے بچے' بوڑھے' جوان' عورتیں' سبھی خوشی سے پاگل ہوئے جا رہے تھے جیسے ان کے سامنے ان کا کوئی دل پسند فعل ہوا ہو۔ بڑے ٹھا کر بڑے فخر سے سینہ تان کر ان لاشوں کے پاس کھڑے ہوئے تھے جیسے خاموش زبان سے کہہ رہے ہوں میں ہی وہ ہوں جس نے تمہارے لئے یہ خوشی کا سامان مہیا کیا ہے۔''

شوبھا کا ردعمل بالکل اس کے برعکس تھا وہ خاموش خاموش سی اور بجھی بجھی لگ رہی تھی۔ اس طرح وہ اور بھی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھا اس کے انگ انگ سے جیسے شراب ٹپک رہی تھی اور بڑی بڑی نشیلی آنکھیں تو جیسے بول رہی تھیں۔ میں اس وقت شوبھا میں ایسا کھو گیا کہ جی چاہا بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں بھینچ لوں اور اس کے وجود کی ساری شراب اپنے اندر اتار لوں۔ میں

انہیں خیالوں میں مگن رہتا اگر رام سروپ میرا کندھا ہلا کر مجھے جھنجھوڑ نہ دیتا وہ کہہ رہا
تھا ''سردار یہاں سے تھانہ گڑوال تقریباً نوے میل ہے۔ اگر ہم اس وقت بھی چلیں
تو صبح تڑکے تک واپس لوٹ پائیں گے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ جو کچھ کرنا ہے
جلدی کیجئے۔ بڑے ٹھاکر کہتے ہیں کہ ہم ابھی اسی وقت یہیں سے روانہ ہو جائیں
۔اس مہم میں جوانوں کا انتخاب اور ان کی تعداد آپ طے کریں گے۔ آپ جو حکم
دیں کیا جائے۔ کسے کسے ساتھ لینا ہے۔؟۔ رام سروپ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور
سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا میں نے کہا ''کسی سے مچیٹا تو کرنا نہیں
ہے۔ صرف تھانے تک لاشیں اور خط پہنچانا ہے میرے خیال میں دس آدمی کافی
رہیں گے' زیادہ بھیڑ کی کیا ضرورت ہے۔؟۔'' رام سروپ پہلے تو میرے جواب پر
تھوڑا سا خاموش ہوا پھر بولا۔ یہ آپ ٹھیک کہتے ہیں سردار' لیکن اگر پولیس سے پھر
ٹکراؤ ہو گیا تو کیا ہو گیا؟ دس آدمی پوری پلٹن کا کس طرح مقابلہ کر سکتے ہیں جب
کہ آج دن میں آپ دیکھ ہی چکے ہیں کہ ہمیں کتنا سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ ویسے آپ
کی مرضی ہے میرا خیال ہے کم از کم 50 جوان تو ہونے چاہئیں ہم سب تھانے سے
ایک میل ادھر ہی رک جائیں گے۔ اور تھانے تک صرف 10 جوان جائیں گے وہ بھی
پیدل تاکہ پولیس کو کسی طرح ہمارے بارے میں شک نہ پڑے۔ ویسے وہ یہ سوچ
بھی نہیں سکتے کہ ہم آج ہی تھانے تک پہنچ جائیں گے۔ میں نے کہا۔ ''تم ٹھیک
کہتے ہو 50 جوان ہی سہی'' تم خود ان کا انتخاب کر لو۔ اور لاشیں وہ.......... رام
سروپ نے بات کاٹ کر کہا'' کل پانچ لاشیں ہی تو ہیں پانچ جوانوں کے ساتھ ایک

ہر لاش گھوڑے کے ساتھ باندھ دی جائے گی۔ اچھا اب میں ذرا اصطبل چلتا
ہوں۔ ویسے ہر جوان کے پاس اس کا گھوڑا موجود ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ کم از کم
دس سدھے ہوئے گھوڑے بھی ضروری ہیں۔ جو وقت بے وقت ہمارے کام آ سکیں
اور خود بخود ٹھکانے تک پہنچ سکیں آپ چاہیں تو کچھ دیر آرام کر کے یہیں میدان
میں آ جائیں یہاں آپ کو جوان تیار ملیں گے۔ میں نے کہا ''یہ تم ٹھیک کہتے ہو'' میں
نے شوبھا کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ آؤ شوبھا۔ ہم چلتے ہیں۔ بڑے ٹھاکر شاید ابھی
یہیں رہنا پسند کرتے ہیں۔ شاید وہ خود اپنے سامنے تمام تیاریاں کرانا چاہتے
ہیں''۔ میری بات سن کر شوبھا نے میرا ہاتھ تھاما اور ہم دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر
اپنے جھونپڑے میں آ گئے۔ میں اور شوبھا۔ خالی جھونپڑا' بوڑھی عورت جو شوبھا کی
ماں تھی ابھی میدان سے واپس نہیں آئی تھی۔ ہم دونوں اندر والے حصے میں چلے
گئے۔ شوبھا ایک پیال دار نرم بستر پر لیٹ گئی۔ اور میں بھی نہ جانے کیا سوچ کر
جا کے دوسرے بستر کے اسی کے پاس لیٹ گیا۔ جیسے ہی میرا جسم اس کے جسم سے
ملا میں بے خود سا ہو گیا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہا ''کیا تو مجھ سے ناراض
ہے؟ اور اس نے میرے اس طرح سوال کرنے پر اپنی بڑی بڑی شرابی آنکھیں بند
کر لیں۔ مجھے وہ بے حد حسین لگ رہی تھی اور اس وقت تو اس کے اس طرح
آنکھیں بند کرنے سے جیسے میں گہرے نشے میں اتر گیا تھا میں نے جذبات سے بھر
کانپتی آواز میں اس سے پوچھا''۔

''میں تجھے کیسا لگتا ہوں۔؟۔ بول۔؟۔'' اس نے دوسرے ہی لمحے میں

ایک سسکی سی لی اور مجھ سے چپٹ گئی۔ بھیا! تو بہت اچھا ہے بھیا!۔ مگر ا
کرتارے کو معاف نہیں کر سکتا؟ بتا نا؟ اس نے مجھ سے اور بھی چپٹتے ہوئے ا
یک وقت مجھ پر کئی کیفیتیں طاری ہو گئیں۔ ایک تو اس کے جسم کی قربت' جس
مجھے اپنے بدن میں ایک عجیب سی میٹھی میٹھی آگ کا احساس ہو رہا تھا جو دم ب
بڑھتا جا رہا تھا۔ دوسرے اس کے بھیا کہنے سے ایک بے نام سی خفت اور جھنجھلا
کا احساس مجھ میں پیدا ہو رہا تھا تیسرے کرتار کے ذکر پر سخت نفرت اور رقاب
احساس مجھے پھونکے دے رہا تھا۔ ان متضاد کیفیات نے مجھے چند ہی لمحوں میں
کر رکھ دیا۔ اور میں ایک دم گھبرا کر اس کے پاس سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ میری یہ حا
دیکھ کر بولی'' کیا ہوا تجھے بھیا؟''۔ میں نے سختی سے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ کچھ نہیں او
ٹہلنے لگا اور ٹہلتے ٹہلتے رک کر میں نے اس سے کہا'' شوبھا! تجھے ایک کا انتخاب
پڑے گا۔ میں یا کرتار۔ بول کسے چاہتی ہے تو۔؟۔ میرا سوال میرے لئے گہ
اور ذو معنی تھا مگر شوبھا کے لئے قطعی واضح۔ میں دونوں کو چاہتی ہوں بھیا۔ اس
کہا۔'' مگر ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں شوبھا'' میرا سوال پھر ذو معنی
یہ شوبھا کا بھائی نہیں اس کا عاشق بول رہا تھا۔ میں جو اس کے عشق میں مبتلا ہو چ
اور میرا جسم جو اس کا بھائی تھا۔ اس وقت میرا جسم نہیں میں بول رہا تھا۔'' مگر
تیرا اس کا کیا مقابلہ۔؟۔ شوبھا بولی۔ اس کے بار بار بھیا کہنے پر مجھے ایک عج
سی نفرت اور غصے کا احساس ہو رہا تھا۔ میں تو اپنی محبوبہ سے بات کر رہا ہوں
میں بہن کون کود پڑتی ہے۔ میں نے چیخ کر کہا۔ مجھے بھیا مت کہو۔ میرے

طرح ناراض ہونے پر وہ سہم گئی اور غمزدہ ہو کر رونے لگی۔ میرے لئے اپنے
فقرے کے معنی مختلف تھے اور میں یہ فقرہ کہنے میں حق بجانب تھا مگر اس کے لئے
اس فقرے کے معنی کچھ اور ہی تھے جس نے اسے بہت تکلیف پہنچائی۔ اس کے
رونے سے جیسے میں پگھلنے لگا اور خواب کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔ اب
میں نے اپنے فقروں پر غور کیا تو مجھے خود اپنے آپ سے ندامت سی ہونے لگی میں
اس کے قریب گیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دی اس وقت میرا جی چاہا
کاش وہ پھر پہلے کی طرح مجھ سے لپٹ جائے۔ مگر اس مرتبہ وہ خاموشی سے لیٹی رہی
۔ میں اس کے پاس پیال کے نرم بستر پر بیٹھ گیا۔ اور یوں ہی اس کا دل بہلانے
کے لئے کہا۔ خیر چھوڑ سب باتیں میرے ساتھ آج کی مہم پر چلے گی تیرا جی بھی کچھ
بہل جائے گا'' میرے اتنا کہتے ہی وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی'' ہاں میں ضرور
چلوں گی تیرے ساتھ ضرور پر بابا جانے دے گا''۔ وہ اس وقت بالکل ننھی سی بچی
لگ رہی تھی جیسے کسی بچے کو روتے روتے کوئی کھلونا مل گیا ہو۔ اور وہ اپنے رونے کو
بھول کر کھلونے سے کھیلنے لگا ہو۔ شوبھا کے رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے مگر
چہرے پر خوشی ناچ رہی تھی' جیسے تازہ کھلے ہوئے گلاب پر شبنم کی نمی' آخر اس کی عمر
ہی کیا تھی۔ ابھی لڑکی ہی تو تھی بس ذرا جذباتی واقع ہوئی تھی۔ میں نے اس کے اس
طرح کھل اٹھنے پر نہیں چاہا کہ اس کا دل توڑ دوں۔'' میں بابا کو راضی کر لوں گا'' میر
ی بات سن کر وہ اٹھی اور جلدی سے ہاتھ منہ دھونے لگی۔ اسی وقت باہر کی طرف
جھونپڑے میں آہٹ سی ہوئی میں نے پردہ ہٹا کر جھانکا تو ایک 18 یا 20 سال کی

لڑکی تھی جو میرے لئے قطعی اجنبی تھی ۔ پتلی دبلی مرگھلی سی، لمبے قد کی ۔ میں فاصلے کے سبب اتنا ہی دیکھ پایا ۔ میں نے بجائے اس سے مخاطب ہونے کے شوبھا سے کہا ۔ ''دیکھ شوبھا کون ہے یہ ۔؟ ۔ پتا نہیں کون لڑکی گھس آئی ہے جھونپڑے میں''، میرے لہجے میں قطعی اجنبیت تھی اور ایک روکھا پن بھی ۔ شوبھا اٹھ کر باہر کی طرف جھونپڑے میں گئی ۔ میں نے سنا ۔ شوبھا کہہ رہی تھی ۔ ارے ارے چلیں کہاں؟ ۔ بھیا تو مذاق کر رہا ہے ۔ تم تو برا مان گئیں بھابی ۔ اس کے جواب میں مجھے ایک میٹھی سی آواز سنائی دی ۔ ہٹ شریر کہیں کی ۔ ابھی سے بھابی کہنا شروع کر دیا ۔ شوبھا نے چیخ کر کہا ۔ ''ہاں ضرور کہوں گی بھابی ایک دفعہ نہیں سو دفعہ ۔ لاجو بھابی لاجو بھابی ۔ کیوں بھیا ۔ ابھی شادی نہیں ہوئی تو کیا ہوا ۔ بات تو بچپن سے پکی ہے ۔ شادی بھی ہو جائے گی ۔ ایسی جلدی کیا ہے ۔'' وہ جھونپڑے کے باہر والے حصے میں چہکتی رہی اور میں جھونپڑے کے اندر عجیب الجھن میں گرفتار ٹہلتا رہا ۔ یہ کیا نئی مصیبت ہے بچپن کی منگیتر ۔ کیسی واہیات لڑکی پتلی، دبلی مرگھلی سی ۔ اور ایک اپنی شوبھا ہے جیسے رس بھری ۔ میرے خیالوں کا سلسلہ پھر شوبھا کی آواز سے ٹوٹ گیا ۔ لو میں جاتی ہوں بھابی اب جو جی چاہے باتیں کر لو ۔ مگر سنو ذرا جلدی کرنا ۔ بابا اور ماں آتے ہی ہوں گے ۔ میں پڑوس میں ہوں ۔'' یہ کہہ کر شاید شوبھا جھونپڑے سے نکل گئی ۔

میں نے سوچا چلو ذرا ایک نظر اس لاجو کو دیکھو تو قریب سے ۔ کیسی ہے؟ میں نے اسی خیال سے جھونپڑے کے باہر والے حصے میں آ گیا ۔ دیکھا کہ وہ جا رہی

ہے میرے قدموں کی چاپ اپنے قریب سن کر ٹھہر گئی اس کی پیٹھ اس وقت میری طرف تھی میں ذرا سا جھجکا ۔ وہ پلٹی ۔ آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے اور رندھے ہوئے گلے کے ساتھ وہ کہہ رہی تھی ''پتہ نہیں کون لڑکی گھس آتی ہے جھونپڑے میں ؟ اب میں تیرے لئے کون ہوئی ۔'' اس نے یہ فقرہ کچھ اس طرح ادا کیا کہ اس فقرے کا سارا درد اور جذبہ مجھ پر اثر کر گیا ۔ وہ قریب سے دیکھنے پر اتنی بری نہ لگی ۔ دبلی پتلی تو ضرور تھی مگر ایک دم گوری تھی ۔ قد اس کے جسم پر پھبتا تھا ۔ اب وہ مجھے مرگھلی نہیں نازک سی لگ رہی تھی، بالکل چنبلی کے پھول کی طرح شوبھا اگر گلاب تھی تو لاجو چنبیلی ۔ میں کچھ دیر اس میں کھویا رہا ۔ وہ پھر بولی ۔ ''تو نے کہا تھا کہ لوٹتے ہی مجھ سے ملے گا ۔ ایک تو اب نہ ملا ۔ پھر بڑے میدان میں میں نے تجھے لاکھ اشارے کئے ۔ تو کچھ توجہ نہ کی اور اب میں موقعہ دیکھ کر تجھ سے یہاں ملنے آئی تو میری بے عزتی کر رہا ہے'' ۔ دیکھ شوبھا کون ہے یہ ...... اس نے اپنی دانست میں میرے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا ۔ میں نے اس کا بنا ہوا منہ دیکھ کر ہنس پڑا ۔ اچھا تو یہ بات تھی ۔ میں نے تو یوں ہی تجھے چڑانے کو کہا تھا کہ پتا نہیں کون لڑکی گھس آئی ہے جھونپڑے میں ۔ تو خواہ مخواہ برا مان گئی پگلی ۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا ۔ یہ بات میں نے اس لئے بنائی کہ کچھ تو وہ مجھے اچھی لگی تھی اور کچھ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ سمجھے کہ میرے لئے وہ اجنبی ہے ۔ میری بات سن کر وہ ایک دم بولی سچ اور میرے سینے سے لگ گئی ۔ میں نے اسے بھینچ لیا اسی وقت دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور وہ فوراً

مجھ سے الگ ہو کر باہر بھاگ گئی اور میں خالی خالی سا کھڑا رہ گیا۔ آنے والے
بڑے ٹھاکر۔ بوڑھی عورت اور رام سروپ تھے۔ شاید ان کے آنے کی خبر شوبھا کو
بھی ہو گئی تھی۔ وہ بھی انہیں کے پیچھے پیچھے جھونپڑے میں داخل ہوئی۔

بڑے ٹھاکر نے آتے ہی بندوق کھونٹی میں ٹانگی اور مجھ سے کہا۔ بیٹے
رنجیتے تمام لوگ جنہیں تمہارے ساتھ اس مہم پر جانا ہے بڑے میدان میں پہنچ چکے
ہیں۔ اور ہر طرح تیار ہیں۔ اب تم جاؤ اور بھگوان کرے کہ خیریت سے واپس آ
۔ یہ کہہ کر بڑے ٹھاکر سامنے بچھے ہوئے تخت پر بیٹھ گئے اور بوڑھی عورت اند
جھونپڑے میں چلی گئی۔ وہ کچھ زیادہ ہی تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی اس سے پہلے ک
میں کچھ کہتا۔ شوبھا نے بڑے ٹھاکر سے کہا'' بابا۔ بھیا کے ساتھ مہم پر میں بھی جاؤں
گی۔ بھیا مجھے بھی لے جانے پر راضی ہے''۔

کیا۔؟۔ بڑے ٹھاکر کی تیوری پر بل پڑ گئے۔'' کیا پاگل ہو گیا ہے رنجیتے
یہ تو ابھی بچی ہے تیری بھی عقل ماری گئی ہے پولیس سے پھر ٹکراؤ ہو سکتا ہے۔ یہ کو
سیدھا سادہ ڈاکا تو ہے نہیں کہ دو ہوائی فائر کئے اور گاؤں بھر ڈاکو رنجیت سنگھ کا نا
سن کر کانپنے لگا۔ پولیس کا معاملہ ہے پولیس کا' میں ہرگز اجازت نہیں دے سکتا کہ
شوبھا تمہارے ساتھ جائے پھر بھی اس کو ٹھیک سے گھڑ سواری بھی نہیں آتی۔ شو
مچل کر بولی' میں بھیا کے ساتھ بھیا کے گھوڑے پر بیٹھ جاؤں گی اس سے کیا فرق
پڑتا ہے۔'' میں نے جیسے ہی شوبھا سے یہ فقرہ سنا میرے دل میں گدگدی
ہونے لگی۔ میں نے خیال ہی خیال میں دیکھنے لگا کہ شوبھا میرے آگے مجھ سے

ی گھوڑے پر بیٹھی ہے اور گھوڑا اونچے نیچے راستوں پر بھاگا چلا جا رہا ہے اسی رو
سا میرے منہ نکل گیا'' ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' بڑے ٹھاکر نے جب یہ سنا تو برس
ے۔ کیا بکتا ہے کیا ٹھیک ہے؟ تجھے کیا ہو گیا ہے رنجیتے۔ کیا تیری عقل بالکل ماری
ی ہے؟ اری سنتی ہو! شوبھا کی ماں یہ تمہارا بیٹا مہم پر شوبھا کو ساتھ لے جا رہا ہے''
ے ٹھاکر نے زور سے ہانک لگائی بوڑھی عورت نے وہیں سے تھکی تھکی آواز میں
ہا'' تم جانو اور یہ جانے' مجھے تو تم دونوں باپ بیٹوں نے تنگ کر دیا ہے ذرا کمر
ی سیدھی کرنے دو گے کہ نہیں؟۔ شوبھا پھر ضد کرنے لگی اور یہاں تک کہ بڑے
ٹھاکر کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس نے انہیں راضی کر ہی لیا اچھا تم جانو! مگر دیکھو
یہ کہے دیتا ہوں کہ دونوں بہن بھائی ساتھ ساتھ رہنا بلکہ رنجیتے ایسا کرو کہ تم اسے
اپنے ہی گھوڑے پر بٹھا لینا''۔ بڑے ٹھاکر نے آخر کار کہہ ہی دیا اس عرصے میں
ام سروپ بیچارہ کھڑا سوکھتا رہا۔

میں اور شوبھا ایک گھوڑے پر اور دوسرے پر رام سروپ بڑے میدان کی
طرف چل دیئے وہاں جا کر دیکھا تو کسی فوجی دستے کا سا سماں تھا قطار در قطار
گھوڑوں پر جوان تیار کھڑے تھے جن کے کاندھوں سے بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں اور
ر میں کارتوسوں کی پیٹی بندھی تھی۔ کمر کے پیچھے ایک تھیلا بندھا تھا جیسا کہ
ہرے ساتھ تھا جس میں موم بتی' ماچس' خنجر اور دوسری ضروری چیزیں تھیں' سب
ے ہاتھوں میں مشعلیں روشن تھیں میرے وہاں پہنچتے ہی تمام جوانوں نے سردار
نجیت سنگھ کی جے' سردار رنجیت سنگھ کی جے کے نعرے لگائے اس قافلے کی رہنمائی

میں اور رام سروپ کر رہے تھے۔ میرے برابر رام سروپ کا گھوڑا دوڑ رہا تھا
اس کے پیچھے تمام جوان گھوڑوں پر سوار اس خفیہ راستے کی طرف بڑھ رہے
جس سے آج دن میں میں اس وادی میں داخل ہوا تھا میرے ساتھ گھوڑے پر ش
مجھ سے چپکی ہوئی بیٹھی تھی وہ اس وقت شاید کرتار کے غم کو بھول گئی تھی اس وقت
کی آنکھوں میں عجیب سی خوشی ناچ رہی تھی جیسے کوئی بچہ اپنے کسی بڑے کے سا
میلا دیکھنے جا رہا ہو۔

مجھے اس کے جسم کی قربت نہ جانے کن کن دنیاؤں کی سیر کرا رہی
۔اب سے پہلے میں نے کبھی عورت سے اتنی دلچسپی محسوس نہیں کی تھی۔ پتا نہیں
ڈاکو رنجیت سنگھ کے جسم کا اثر تھا یا کچھ اور کہ اس وقت میری نس نس میں بجلی
کوندتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ہم سرنگ نما غار کے دہانے پر پہنچ چکے تھے۔ یہ دہانہ
چوڑا تھا کہ بیک وقت دو گھوڑے اس میں داخل ہو سکتے تھے میرے اور رام سرو
کے گھوڑے آگے تھے ہم دونوں سب سے پہلے اس میں داخل ہوئے اور
ہمارے پیچھے بقیہ گھوڑے دو دو کر کے اس سرنگ نما غار کے دہانے میں داخل ہو
رہے۔ غار مشعلوں کی روشنی سے روشن ہو گیا تھا۔ اندر سے بھی یہ غار زیادہ چوڑا نہ
بس آگے کی طرف لمبا لمبا سا تھا اور بہت دور تک اسی طرح چلا گیا تھا ہم سب
طرح گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے غار کے آخر تک پہنچے۔ رام سروپ گھوڑے
اترا اور ایک طرف غار کی دیوار میں لگے ہوئے گول سے کڑے کو گھما کر کھینچا
بالکل ویسا ہی کڑا تھا جیسا آج دن میں میں نے غار کے باہر دیکھا تھا۔ بڑی زو

گڑگڑاہٹ سی ہوئی جیسے کوئی بڑا سا پتھر اپنی جگہ سے لڑھکتا ہوا نشیب میں گرتا چلا
جا رہا ہو۔ اور چند لمحے بعد ہی سامنے راستہ نمودار ہو گیا۔ رام سروپ اسی طرح
کڑے میں ہاتھ ڈالے کھڑا رہا اور تمام لوگ دو دو کی قطار میں باہر نکلتے رہے اور
جب سب باہر چلے گئے تو سب سے آخر میں رام سروپ باہر نکلا۔ غار کا دہانہ اسی
طرح رام سروپ کے نکلتے ہی خود بخود بند ہو گیا۔ اب ہم اسی درے میں تھے جس
میں آج ہی میں نے سفر کر چکا تھا۔ یہ درہ کیونکہ خاصا تنگ تھا اور اس میں برابر برابر
صرف دو گھوڑے بمشکل دوڑ سکتے تھے اس لئے دو دو کی ہی قطار میں ہمارا قافلہ
درے سے باہر نکلا۔ اب پھر رام سروپ میرے گھوڑے کے برابر آ گیا تھا۔ مجھے
اس کا اس طرح ساتھ ساتھ رہنا کھل رہا تھا مگر میں کرتا بھی کیا۔ تھانہ گڑوال کے
راستے سے میں ناواقف تھا اس لئے دانستہ اپنے گھوڑے کو رام سروپ کے گھوڑے
سے ذرا پیچھے ہی پیچھے دوڑا رہا تھا مگر وہ کمبخت جب محسوس کرتا کہ میں اس کے
گھوڑے کے پیچھے ہوں تو گھوڑے کی رفتار کم کر کے برابر آ جاتا اس سے مجھے بڑی
کوفت ہوتی۔ شاید وہ ایسا اس لئے کرتا تھا کہ کہیں اس سے سردار کی توہین نہ ہو۔
اس لئے کہ سردار کے گھوڑے سے آگے گھوڑا دوڑنا ان کے یہاں بے ادبی شمار ہوتا
یہاں تک کہ سردار کے گھوڑے کے برابر برابر بھی ہر شخص نہیں چل سکتا تھا سوائے
اس کے جسے خود سردار اس کی اجازت دے دے۔ میں دراصل یہ چاہتا تھا کہ شوبھا
سے باتیں کرتا چلوں جسے اور کوئی نہ سن پائے۔ مگر اس آفت ناگہانی رام سروپ کو
کیا کرتا جو جان ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔

ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے رات کا سناٹا مجروح ہوتا رہا۔ ا
پہاڑی سلسلے اور چٹانیں خاصی پیچھے رہ گئی تھیں اور سامنے بہت دور کچھ مدھم سی رو
کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ ہم کیونکہ اس وقت ذرا اونچی سطح پر دوڑ رہے
اس لئے وہ روشنی ہمیں کافی دور اونچائی میں دکھائی دے رہی تھی مگر تھوڑی دیر بعد
آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ میں نے رام سروپ سے کہا جو برابر ہی دوڑ رہا تھا۔ ر
سروپ وہ روشنی کیا ہوئی جو ابھی کچھ دیر پہلے نظر آرہی تھی۔؟۔ رام سروپ ش
میرے سوال پر کچھ حیران سا ہوا پھر بولا'' سردار کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہم
راستہ کچھ بدل دیا ہے۔ اب ہم تھانے کے پیچھے سے چلیں گے۔ تاکہ پولیس کو
طرح کا شبہ نہ ہوجائے اور اس کی نظر سے ہماری نقل وحرکت چھپی رہے۔ میں
جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔ ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں یہ تو بھول ہی گیا
اس لئے تو میں تمہیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ میرے اس طرح تعریف
کرنے پر رام سروپ کا سینہ اور زیادہ چوڑا ہوگیا وہ بولا۔ سردار۔ یہ تو آپ کی محبت
ہے ورنہ میں کس قابل ہوں'' اس نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا اور
بھی آپ ہی کی محبت ہی ہے کہ پہلے مجھے اپنے ساتھ نہ رکھتے ہوئے بھی آپ
محسوس کرتے تھے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ گرنام سنگھ نے سن لیا تو مجھ سے بہ
جلے گا۔ کیونکہ وہی تو اس سے پہلے آپ کا دایاں بازو تھا۔ آج آپ نے سب
مجھ پر چھوڑ دیا ہے تو یہ آپ کا احسان ہے۔ میں نے رام سروپ سے جب یہ
جلدی سے بولا۔ ٹھیک ہے گرنام سنگھ کو بھی ہم بہت چاہتے ہیں مگر ہر آدمی کی حیثیت

اپنی جگہ ہے گرنام گرنام ہے اور رام سروپ رام سروپ ہے۔ مجھے اپنی غلطی کا بار بار
احساس ہوجاتا تھا اور میں فوراً بات بنادیتا تھا۔ اس لئے کہ مجھے کیا خبر تھی کہ یہاں
کوئی کم بخت گرنام سنگھ بھی ہے جو میرے ساتھ بلکہ میرے ساتھ کیا ڈاکو رنجیت سنگھ
کے ساتھ اکثر ڈاکوؤں میں شریک ہو چکا ہے اور وہ میرا دایاں بازو ہے۔ میں نے
کچھ سوچ کر رام سروپ سے کہا'' رام سروپ' کیا آج ہمارے ساتھ گرنام سنگھ بھی
ہے اس مہم میں۔؟'' اس نے کہا۔ نہیں سردار۔ جب آپ نے جوانوں کا انتخاب
مجھ پر چھوڑ دیا تھا تو میں نے سوچا اسے کیوں تکلیف دوں' خود ہی آپ کے نائبی
کیوں نہ کروں۔؟۔ رام سروپ کے لہجے سے کچھ چور پن کا سا احساس ہو رہا تھا
جیسے کسی نے اسے عین چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو۔ میں تمام باتیں بھانپ گیا۔
دراصل ہوا یہ ہوگا کہ میری ناواقفیت کے سبب رام سروپ یہ سمجھا ہوگا کہ سردار مجھ پر
آج زیادہ مہربان ہیں اور اس موقع سے فائدہ اٹھانے چاہئے۔ اس نے گرنام
سنگھ کو جو میرا دست راست تھا اس مہم سے اڑا دیا۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس کی اطلاع کس
طرح ہوسکتی تھی۔ جبکہ میں ڈاکو رنجیت سنگھ کے بارے میں سوائے اس کے کہ وہ
زبردست خونی اور دلیر آدمی ہے۔ کئی دفعہ پولیس کا محاصرہ توڑ کر بھاگ چکا ہے اور
اس کے سر کی قیمت حکومت نے بیس ہزار مقرر کی ہے۔ اور کچھ بھی نہیں جانتا تھا
۔ اب رفتہ رفتہ مجھ پر تمام حالات روشن ہوتے جارہے تھے جو مختصراً یہ تھے کہ میں
اب جس جسم میں پناہ گزین تھا۔ وہ مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ کا جسم تھا۔ جس کے باپ
بڑے ٹھاکر اور ماں وہ بوڑھی عورت تھی جس کی بہن شوبھا اور بچپن کی منگیتر لاجو تھی۔

مگر میرے سامنے یہاں ایک دوسری الجھن تھی میں پہلی ہی نظر میں شوبھا
بھرے بھرے گداز جسم پر عاشق ہو چکا تھا۔ اس جسم کو اپنانے سے پہلے مجھے عورت
کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مگر اب نہ معلوم کیوں مجھے ایسا لگتا تھا کہ بغیر عورت کے میں زندہ
نہیں رہ سکتا اور میرا وجود بغیر اس کے نامکمل سا ہے۔ اس عجیب احساس نے مجھے
جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کیا خبر ایسا ہو کہ مرحوم ڈاکو رنجیت سنگھ کا جسم اس شدت سے
عادی ہو۔ میں نے اس روح کی حد تک مرحوم کہا ہے اس لئے کہ اس کا جسم تو زندہ
تھا مگر اس کی روح اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اس کے جسم میں اس وقت میں تھا
میں یعنی علی حسن' اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ مجھے جس سے جنون کی حد تک عشق ہو
گیا تھا وہ اس جسم کی بہن تھی۔ میں انہیں خیالوں میں گم صم گھوڑا دوڑاتا رہا یہاں تک
شوبھا کی آواز نے مجھے خیالوں کی دنیا سے باہر کھینچ لیا۔ بھیا! ابھی اور کتنی دور ہے
تھانہ۔؟۔ میں تو بیٹھے بیٹھے تھک گئی۔ میں اس کی آواز سن کر چونکا اور اس کے اس
طرح بھیا کہنے پر جی ہی جی میں گھٹ کر رہ گیا۔ اور بے رخی سے بولا۔ ''مجھے نہیں
معلوم اگر تجھے ایسی ہی تھکن کا خیال تھا تو ہمارے ساتھ آئی ہی کیوں۔؟'' میرے
لہجے کی خفگی محسوس کر کے وہ کچھ سہم سی گئی۔ اور خاموش ہو گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ رام سروپ اپنے گھوڑے کو روک
رہا ہے یہ ایک موڑ تھا۔ اور موڑ آتے ہی میں نے دانستہ اپنا گھوڑا ذرا سا اس سے
پیچھے کر لیا تھا تاکہ وہ رہنمائی کر سکے۔ تمام قافلہ رک گیا۔ موڑ مڑتے ہی سامنے ہی
پھر روشنی سی دکھائی دی۔ جیسی بہت پہلے دکھائی دی تھی رام سروپ کے اشارے پر

دو نوجوان آگے بڑھے جن کے گھوڑوں کے ساتھ پانچ سپاہیوں کی لاشیں بندھی
ہوئی تھیں۔ گھوڑوں سے لاشیں کھول گئیں اور اب میری آنکھوں نے ایک ایسا منظر
دیکھا جسے دیکھ کر میں نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ رام سروپ نے اپنی جیب
سے ایک پرچا نکالا اور اسے ایک طرف سے پرو دیا اور وہ خنجر اس نے دستے تک
اس مردہ سپاہی کے سینے میں اتار دیا۔ رام سروپ کہہ رہا تھا'' میرے ساتھ صرف
دس جوان پیدل یہاں سے چلیں گے۔ سردار۔ کیا حکم ہے اجازت ہے؟۔ اس نے
میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ میں نے کہا۔ ٹھیک ہے ہم یہیں رک کر تمہارا انتظار کر
رہے ہیں۔ اس پر ایک اور نوجوان اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر آیا اور بولا۔ ''رام
سروپ اگر کسی طرح کا خطرہ محسوس کرو تو فوراً اشارہ دے دینا۔ ہم تمہاری مدد کو پہنچ
جائیں گے۔

یہ بھی ایک بھاری بھر کم جوان تھا۔ بعد میں معلوم ہوا یہ رام سروپ کا بڑا
بھائی جرنجی تھا۔ لال لال خونی آنکھوں والا جرنجی۔ رام سروپ مع دس جوانوں کے
روانہ ہو گیا اور ہم سب وہیں ٹھہر کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ میرے قریب اس
وقت جرنجی تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اس کا ذہن پڑھنے لگا۔ وہ
اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی خطرناک موقع پر سردار نے
پہل نہ کی ہو۔ پتا نہیں کل سے سردار کو کیا ہو گیا ہے۔ کل تمام ساتھیوں کو چھوڑ کر
دشمن کے مقابلے سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور آج جب رام سروپ نے کہا کہ میں
دس جوانوں کو لے کر آگے جاتا ہوں تو بھی سردار نے اسے نہیں روکا حالانکہ ہمیشہ

سردار نے ایسے موقعوں پر پہل کی ہے میں نے اس کی طرف آنکھیں ہٹالیں۔

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے آہستہ سے چرنجی کے قریب اپنا منہ لے کر کہا۔ چرنجی تم غلط سوچ رہے ہو۔ یہ سردار ہی بہتر طور پر جان سکتا ہے کہ کس موقع پر کیا کرنا چاہئے۔؟۔ اگر اس طرح قدم قدم پر تم لوگ میری انگلی پکڑ کر چلتے رہے میرے بعد تمہارا کیا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے سامنے ہی تمہارے اندر اتنی خود اعتمادی پیدا کر دوں کہ تم میرے بعد بھی کسی خطرناک سے خطرناک موقع پر اپنے اپنے آپ کو کم نہ پاؤں۔ میری بات سن کر چرنجی ایک دم گھوڑے پر چونک سا پڑا۔اور جلدی سے گھبرا کر بولا۔ ''نہیں سردار میں ایسا کچھ نہیں سوچ رہا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے آپ تو خود بہت دلیر اور بہادر ہیں۔ آپ کسی طرح ہم سب سے پیچھے نہیں۔ دلیری، عقل، اور خون خرابے میں ہم سے لاکھ گنے آگے ہیں میں ایسا کس طرح سوچ سکتا ہوں۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ جھوٹ مت بولو چرنجی۔ کیا تم بھول گئے کہ آج شام ہی میں نے کرتار کو کس طرح پہچان لیا۔ میں تمہارا سردار ہوں۔ تمہارے دلوں کا سارا حال مجھ پر روشن ہے۔ مجھ سے زیادہ تمہیں کون جان سکتا ہے۔ اگر تمہیں یقین نہ ہو تو میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ ابھی تم یہ بھی سوچ رہے تھے کہ آج دن میں میں تمہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ جبکہ میں نے ایسا پہلے کبھی نہیں کیا اور ..... چرنجی میری بات سن کر بوکھلا گیا اور میری بات کاٹ کر جلدی سے بولا۔ سردار، سردار، مجھے معاف کر دیجئے مجھ سے واقعی قصور ہوا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے گھوڑے سے اترا اور میرے پیر پکڑ کر گڑگڑانے لگا۔ اس نے کہا آپ ہمارے ستا سمان ہیں۔

سردار کا درجہ باپ کے برابر ہوتا ہے۔ ہم سب آپ کی اولاد کی جگہ ہیں۔ معاف کر دیجئے مجھے۔ مجھ سے بھاری غلطی ہوئی جو میں نے آپ کے بارے میں ایسا سوچا۔۔ یہ کہہ کر وہ بھاری بھرکم نوجوان رونے لگا۔ بقیہ تمام جوان جو ذرا پیچھے گھوڑوں پر مستعد بیٹھے تھے اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ میں نے اس کی یہ حالت دیکھ کر کہا۔ ''چرنجی میں نے تجھے معاف کیا۔ تو بھی آخر انسان ہے۔ غلطی بڑے بڑوں سے ہو جاتی ہے۔ جا اپنے گھوڑے پر آرام سے بیٹھ۔ دل سے اس بات کو نکال دے کہ ہم نے تجھ سے سخت لہجے میں بات کی۔ جا! چرنجی اتنا سن کر اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر بقیہ جوانوں کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں جوانوں سے کوئی 20`25 گز آگے کھڑا تھا۔ میں نے شوبھا سے کہا ''اگر تم گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہو تو آؤ نیچے اتر چلیں یہ جگہ ویسے بھی بڑی خوبصورت لگ رہی ہے اور پھر اس پر یہ چاندنی رات تو اور جادو جگا رہی ہے۔'' شوبھا میری بات سن کر گھوڑے سے اتر آئی۔ اور بولی۔ ''ابھی رام سروپ کو گئے چند منٹ ہوئے ہیں اور کم سے کم اسے واپس آنے میں گھنٹا تو لگے گا ہی۔ کیوں نہ ہم تھوڑی دیر اس ساتھ والے باغ میں ٹہلیں۔ کیا خیال ہے بھیا؟۔ میں نے اس کی تجویز کو پسند کیا۔ بلکہ اس کی اس تجویز پر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا میں نے سوچا شوبھا اور میں۔ باغ، چاندنی رات، تنہائی، ٹھیک ہے چلو چلتے ہیں، میں نے اس سے کہا، اور پھر چرنجی کے قریب پہنچ کر بولا ''شوبھا اور میں اس برابر والے باغ میں گھوم کر ابھی آتے ہیں کوئی ایسی ویسی بات ہو تو ہم یہیں قریب ہی موجود ہیں۔ میں فوراً آجاؤں گا۔

میرے یہ کہنے پر باقی جوان حیرت سے مجھے دیکھنے لگے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں او
شاید کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ چرنجی نے اس کی طرف مڑ کر اپنی لال لال آنکھو
سے دیکھا اور ان کے سر جھک گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس گروہ میں چرنجی کی
حیثیت بھی خاصی مضبوط ہے۔

اس کے بعد میں اور شوبھا ٹہلتے ہوئے باغ میں داخل ہو گئے۔ ہمارے
پیروں کے نیچے سوکھے پتے آ کر چڑ چڑ کی آوازیں پیدا کر رہے تھے اور ہمیں باغ
میں اس طرح ٹہلنا بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے شوبھا سے کہا۔ آؤ اس پیڑ
کے نیچے تھوڑی دیر لیٹ لیں۔ پتوں کا بستر بڑا مزہ دے گا۔'' شوبھا نے میری اس
تجویز سے اتفاق کیا اور ہم دونوں اوندھے آمنے سامنے لیٹ گئے۔ شوبھا نے
کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے کہا۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے اس وقت۔'' میں بھی کہنیوں
کے بل ذرا سا اٹھا۔ میرے اور شوبھا کے چہرے بالکل آمنے سامنے تھے۔ اور اس
کی گرم گرم سانسیں میری سانسوں میں گھل رہی تھیں۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں اور
شوبھا صدیوں سے یہیں اسی حالات میں پڑے ہیں۔ اس کی گرم گرم سانسیں اور
سینے کا اتار چڑھاؤ، مجھ میں طوفان مچائے ہوئے تھا۔ میں نے سوچا کہ بڑھ کر اپنے
سلگتے ہوئے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دوں۔ مگر میں نے ایک نظر پہلے اس کی
حسین بڑی بڑی نشیلی آنکھوں میں جھانکا۔ ایک دم مجھے اور اس ایک جھٹکا سا لگا اب
میں اس کے ذہن کو پڑھ سکتا تھا۔ اس وقت وہ کرتار کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

کرتار کے نام سے میں ایک دم سلگ اٹھا۔ اور اپنے ذہن میں میں نے سوچ کر
شوبھا کو حکم دیا، کرتار کو بھول جا وہ بے وفا ہے پولیس کا مخبر ہے۔ تیرے بھائی کا دشمن
ہے۔ وہ تجھے بھی نہیں چاہتا۔'' اس کے ذہن کا جواب تھا۔ ''نہیں میں اسے نہیں
بھول سکتی کسی قیمت پر نہیں، میں اسے چاہتی ہوں'' میں نے پھر اسے حکم دیا۔ تجھے
اسے بھولنا پڑے گا اور اب جب تجھے ہوش آئے گا تو تو اسے بھول چکی ہوگی۔ اس
نے تیری عزت پر ہاتھ ڈالا وہ تیرا اور تیرے بھائی کا دشمن ہے بس تجھے اتنا یاد رہ
جائے گا۔ اور تو خود بڑے ٹھاکر سے یہ کہے گی کہ میں کرتار کو خود گولی ماروں گی۔ خود
اپنے ہاتھ سے تو کل صبح اسے گولی مارے گی''۔ اس نے کہا ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہو
گا۔ اب مجھے اپنی ایک اور قوت کا احساس ہوا کہ میں حکماً بھی کسی سے سب کچھ کرا
سکتا ہوں۔ یہ سوچ کر میں اور بھی خوش ہوا اب میرے ذہن میں ایک بالکل ہی نئی
بات آئی میں نے اپنے ذہن سے پھر اسے ایک حکم دیا۔ رنجیت سنگھ تیرا بھائی نہیں تیرا
عاشق ہے اور تو بھی اسے دل و جان سے چاہتی ہے۔ وہ جو بھی تجھ سے کہے گا
تمہیں کوئی انکار نہیں ہوگا۔ سب اسے تیرا بھائی کہیں گے مگر تو اسے اپنا عاشق سمجھے گی۔
تو بھی اسے چاہے گی۔ اور ہوش میں آنے کے بعد تو یہ سب کچھ بھول جائے گی
کہ میں نے حکماً تجھ سے یہ سب کچھ کرایا ہے بس تجھے اتنا یاد رہ جائے گا کہ رنجیت
کو چاہتی ہے اور اس کا ہر حکم مانتی ہے اور یہ کہ کرتار تیرا اور تیرے عاشق رنجیت
کا دشمن ہے جو اسے پولیس کے ہاتھوں پکڑوا دینا چاہتا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے

ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں سے آنکھیں جدا کیں۔۔اور پھر ایک بار اس
اور مجھے ایک خفیف سا جھٹکا لگا۔اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔اور مجھے نزدیک
کر شرما کر نگاہیں جھکا لیں۔میرے دل پر جیسے بجلی سی گر گئی میں نے کہا میری جان
شوبھا ادھر دیکھ' اور یہ کہہ کر میں نے اپنے سلگتے ہوئے ہونٹ اس کے گلاب ہونٹوں
میں پیوست کر دیئے' میں نے اسے گھسیٹ کر اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔اور وہ بھی
میری گرمجوشی کا جواب اسی گرمجوشی سے دے رہی تھی۔ہم دونوں نہ جانے کب تک
اسی طرح لیٹے رہے۔ہم وہاں سے اٹھے تو زمین پر بچھے ہوئے پتے سرخ ہو چکے
تھے میں اسے سہارا دیئے اٹھا کر سڑک کی طرف چلنے لگا اور سڑک پر پہنچنے سے پہلے
ایک بار پھر میں اسے بھینچ کر خوب پیار کیا۔ہم اب سڑک پر نکل آئے تھے۔میں آج
ایک ایسی لذت سے ہمکنار ہوا تھا جس کا تصور بھی میں نے آج سے پہلے نہیں کیا تھا
ایک عجیب نشہ سا ایک عجیب کیف سا میرے جسم میں' میری نس نس میں سرایت کر رہا
تھا۔ہمیں ابھی اپنے گھوڑوں کے پاس آئے مشکل سے ایک منٹ ہوا ہو گا کہ دور
سے رام سروپ اور اس کے بقیہ ساتھی آتے ہوئے نظر پڑے۔رام سروپ نے
آتے ہی کہا۔سردار' مبارک ہو تمام کام ٹھیک طرح اور خاموشی کے ساتھ ہو گیا
۔ہم پانچوں لاشیں ایک رسی سے باندھ کر بالکل تھانے کے سامنے پھینک آئے
ہیں۔میں نے کہا۔کیا وہاں پہرا تھا۔؟۔رام سروپ بولا۔ہاں پہرا تو تھا۔مگر
تھانے کا پھاٹک اندر سے بند تھا اور اندر ہی پانچ چھ سپاہی مستعدی سے پہرا دے

رہے تھے مگر ہماری کام میں آسانی تھانے کے پھاٹک نے کر دی۔اس کے اندر
سلاخیں نہیں ہیں بلکہ ٹین کی چادر چڑھی ہوئی ہے۔ہم اکڑوں بیٹھ کر بالکل تھانے
کے پھاٹک کے سامنے وہ پانچوں لاشیں پھینک آئے اور اسی طرح واپس آ گئے۔
میں نے کہا۔''شاباش رام سروپ تم نے یہ کام کیا ہے۔مجھے تم سے ایسی ہی امید
تھی''۔مگر اس کا دوسرا فقرہ سن کر میں چونک پڑا۔وہ کہہ رہا تھا۔''سردار اگر چاہیں تو
اب شوبھا کو میرے گھوڑے پر بٹھا دیں۔آپ تھک گئے ہونگے۔؟۔۔کیا۔؟۔میں
نے ذرا سختی سے کہا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔اسے اور مجھے جھٹکا سا
لگا۔وہ سوچ رہا تھا۔ہائے شوبھا۔میری جان۔اگر تو اس طرح میرے ساتھ
گھوڑے پر بیٹھتی تو کیا مزہ آتا' تو تو ابھی میرے پیار سے واقف ہی نہیں کہ میں
تجھے کتنا چاہتا ہوں۔شوبھا شوبھا' اس کا ذہن شوبھا شوبھا کی تکرار میں مبتلا تھا۔میں
نے اسے اپنے ذہن ہی ذہن میں حکم دیا۔شوبھا' تمہیں نہیں چاہتی رام سروپ یک
طرفہ محبت بے معنی ہے۔دوسرے وہ تمہارے سردار کی بہن ہے۔اب جب تم ہوش
میں آؤ گے تو تمہارے دل سے شوبھا کا خیال نکل چکا ہو گا۔اور تم اسے صرف اپنی
بہن سمجھو گے۔صرف بہن۔ اس کے ذہن نے جواب دیا۔مگر میں تو اسے بے حد
میں نے پھر اس کی سوچ کاٹ دی''۔کچھ نہیں آج سے تم اسے صرف بہن ہی
سمجھو گے بس اور کچھ نہیں۔''اب اس کے ذہن کا جواب تھا۔بہتر ہے اب سے میں
شوبھا کو بہن ہی سمجھوں گا۔وہ میری بہن ہی کے برابر ہے۔میں نے رام سروپ کی

آنکھوں سے آنکھیں ہٹالیں اور کہا۔ ہاں رام سروپ تم کیا کہہ رہے تھے کہ شوبھا کو تمہارے گھوڑے پر سوار کردیں؟۔ جی نہیں آپ ہی انہیں بٹھالیں۔

یہ سن کر میرے دل سے ایک کانٹا سا نکل گیا اور اب ہم پھر اپنے ٹھکانے کی طرف واپس جا رہے تھے۔ میں اس وقت سوچ رہا تھا کہ صبح جب بڑے ٹھاکر سے شوبھا کہے گی کہ میں خودکرتار کو گولی ماروں گی تو ان کا کیا حال ہوگا۔ اور خودکرتار اس وقت کیا سوچے گا جب وہ ستون سے بندھا ہوا اپنی موت کی گھڑیاں گن رہا ہوگا۔



جب ہم گول وادی میں پہنچے تو صبح نمودار ہونے والی تھی۔ اس
میں سرسبز و شاداب وادی بہت حسین لگ رہی تھی عجیب خوابناک سا منظر
میرے ذہن سے ابھی رات کا خمار نہیں اترا تھا۔ باغ' شوبھا اور میں' شوبھا
وقت بھی میرے گھوڑے پر میرے ساتھ چپکی بیٹھی تھی جیسے وہ میرے وجود ہی کا
حصہ ہو' وادی میں داخل ہوتے ہی تمام جوان اپنے اپنے جھونپڑوں کی طرف ر
ہو گئے اور میں شوبھا کو لئے ہوئے اپنے بڑے جھونپڑے کی طرف بڑھنے لگا۔
وادی میں جاگ نہیں ہوئی تھی۔ میں جب سب سے الگ ہو گیا اور ایک اکیا
سے گزرنے لگا تو شوبھا نے پیچھے مڑ کر اپنی بڑی بڑی شرابی آنکھوں سے میری ط
دیکھ کر کچھ کہنا چاہا۔ اس وقت اس کی آنکھیں پہلے سے بھی سوگنا زیادہ خوبصو
لگ رہی تھیں۔ بڑی بڑی آنکھوں میں ہلکے گلابی ڈورے۔ میں نے جھک کر ا
آنکھیں چوم لیں اور وہ میرے چوڑے چکلے سینے میں اور بھی زیادہ سمانے کی کو
کرنے لگی۔ اچانک میری نظر گلی کے جھونپڑے کے ایک دروازے پر پڑی

کے باہر ایک جانی پہچانی سی دبلی پتلی' مرگھلی سے لڑکی کھڑی تھی جھونپڑے کے
دروازے سے پیٹھ لگائے۔ ہمارا گھوڑا جیسے ہی اس کے قریب پہنچا' ہم نے اسے
پوری طرح پہچان لیا۔ یہ لاجو تھی یعنی میرے موجود جسم ڈاکو رنجیت سنگھ کی منگیتر۔
میں اسے اس وقت یہاں دیکھ کر عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ تو کیا
یہ صبح ہی صبح میرے انتظار میں یہاں آ کر کھڑی ہو گئی ہے یا رات بھر سو نہیں سکی' آخر
چکر کیا ہے؟ لیکن مجھے اس سے ایک قسم کی ہمدردی سی ضرور محسوس ہوئی اور میں نے
اپنا گھوڑا اسے دیکھ کر روک لیا شوبھا خاموش تھی۔ وہ گھوڑے ہی پر بیٹھے بیٹھے ایک
مرتبہ کسمائی اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی جیسے اسے میرا یہاں رکنا ناگوار ہوا ہو۔
میں جیسے ہی گھوڑے سے اترا لاجو بولی۔ ''بس جا آرام کر' میں یہی دیکھنے یہاں
کھڑی تھی کہ تو ساتھ خیریت کے واپس آ جائے سو بھگوان نے میری سن لی''۔ یہ کہہ
کر اس نے اپنی بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا اس نظر میں ایک عجیب سپردگی
ایک عجیب کیف تھا۔ وہ پھر بولی۔

''اچھا تو تیرے ساتھ شوبھا بھابی گئی تھی۔'' میں نے سوچا شوبھا ضرور کچھ
بولے گی اور اپنی خاموشی ختم کر دے گی۔ مگر وہ اسی طرح منہ پھلائے گھوڑے پر بیٹھی
رہی۔ اس کے اس رویے سے بھی لاجو نے کوئی غلط اثر نہ لیا اور بولی۔

''تو نے ضرور شوبھا کو ناراض کر دیا ہے چل اسے منا' ورنہ میں تجھ سے
نہیں بولوں گی'' وہ اٹھلا کر شوبھا کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور کہا'' کیوں ری کیا
بات ہے؟ تجھے سانپ کیوں سونگھ گیا ہے؟ اگر تجھ سے اس نے کچھ کہا ہے تو مجھے بتا۔

میں اس کی ساری سرداری ابھی جھاڑ دیتی ہوں' اری بولتی کیوں نہیں؟ اچھا
تھک بہت گئی ہے' لے میں تجھے اور زیادہ نہیں ستاتی۔ ویسے میں تجھے بتا دوں
رات بھر میں بھی نہیں سوئی ہوں۔ ماں نے لاکھ مجھ سے کہا کہ اری سو جا وہ خیر
کے ساتھ آ جائے گا۔ مگر میں یہیں جھونپڑے کے دروازے پر رات بھر کھڑی ر
اور تھک ہار کر ماں بھی سو گئی...... اچھا اب جا تو بھی سو میں چلتی ہوں۔'' یہ کہہ
وہ میرے قریب سے ہوتی ہوئی اپنے جھونپڑے میں داخل ہوگئی وہ بھی غالباً را
بھر کی جاگ سے تھک گئی تھی۔ میں آگے بڑھا اور پھر سے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

گھوڑا آگے بڑھتے ہی شوبھا مجھ پر برس پڑی۔ ''یہ کم بخت لاجو مجھے ای
نظر نہیں بھاتی' دکھ رہتے میں تجھے چاہتی ہوں' اور ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتی
کوئی اور بھی تجھ سے محبت کرے اگر تو نے اسے نہ چھوڑا تو یا تو میں اپنے آپ کو گو
ماروں گی یا تجھے، سمجھا کہ نہیں'' اس نے غصے سے میری طرف مڑ کر کہا۔

میں نے اسے ذرا اور چڑانے کے لئے کہا۔ ''مگر میری جان' وہ تو میر
منگیتر ہے' یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ بچپن کا رشتہ ختم ہو جائے' شادی تو میں اسی
کروں گا' ہاں محبت تجھ سے کرتا رہوں گا''۔

اس نے میرے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے منہ چڑا کر کہا۔ شادی تو میں
اسی سے کروں گا' ہاں محبت تجھ سے کرتا رہوں گا''۔ گولی نہ ماردوں گی تجھے۔

میں نے مصنوعی طور پر ڈرتے ہوئے کہا ''ارے باپ رے تو تو' بہت
خطرناک ہے'' ہم دونوں اسی طرح نوک جھونک کرتے ہوئے اپنے جھونپڑے تک

پہنچ گئے۔

ہماری آہٹ سے شاید بڑے ٹھاکر کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس لئے جیسے ہی
ہمارا گھوڑا جھونپڑے کے آگے رکا انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ بڑے ٹھاکر کو دیکھتے
ہی شوبھا ایک لمحے کے لئے چونکی جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو وہ جھونپڑے میں گھستے
ہوئے بولی۔

''بابا' کرتار کی نمک حرامی اور بزدلی کا بدلہ میں اس سے لوں گی......''

''کیا؟۔ بڑے ٹھاکر شوبھا کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئے۔''

''ہاں'' اسے آپ نہیں...... میں اپنے ہاتھ سے گولی ماروں گی اس نے
پولیس سے مخبری کر کے ہمارے ساتھ ہی نہیں پوری وادی کے ساتھ غداری کا ثبوت
دیا ہے اور وہ میری محبت کا جھوٹا ڈھونگ رچا کر سزا سے بچنا چاہتا ہے ایسا ہرگز نہیں
ہوگا۔'' یہ سنتے ہی بڑے ٹھاکر نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا اور رندھی ہوئی آواز
کے ساتھ بولے۔

''میری بیٹی' میری شوبھا تو نے میری عزت رکھ لی، تیرے اندر میرا ہی
خون دوڑ رہا ہے تو ٹھاکر ہی کی اولاد ہے...... ٹھاکر کی'' یہ کہہ کر بڑے ٹھاکر خوشی
سے چیخے۔ ''شوبھا کی ماں اسے شوبھا کی ماں' ارے سنتی ہو' تمہاری بیٹی کیا کہہ رہی
ہے' یہ ہے اصل ٹھکرائن۔'' بڑے ٹھاکر کی آواز پر اندر جھونپڑے سے ایک نیند میں
ڈوبی ہوئی سی آواز آئی۔

''ارے کیا آفت آ گئی! صبح ہی صبح کیوں جھونپڑا سر اٹھا رکھا ہے۔'' یہ

بڑی ٹھکرائن کی آواز تھی۔

''اب تم آتی ہو یا میں تمہارے اوپر مٹکا الٹ دوں، آخر صبح ہوگئی اور تم ابھی تک پڑی سو رہی ہو۔'' بڑے ٹھاکر کڑکے، ان کی کڑک دار آواز سن کر بڑی ٹھکران جھونپڑے کے اگلے حصے میں داخل ہوئیں اور مجھے دیکھ کر بولیں۔

''ارے تو واپس آ گیا گڑبڑ تو نہیں ہوئی کچھ، میں تو ڈر رہی تھی کہ تیرے ساتھ شوبھا جا رہی ہے کہیں کچھ گڑبڑ نہ ہو جائے''۔

بڑے ٹھاکر فخریہ سینہ تان کر بولے ''ہونہہ شوبھا کو تم کیا سمجھتی ہو آخر وہ میرا خون ہے میرا...... ایک ٹھاکر کا خون...... آج تم اس کا نشانہ بھی دیکھ لوگی۔ دیکھنا ہوں میری محنت کتنی کارگر ہوئی ہے؟''۔

''کیا مطلب؟ کیا نشانہ؟ ٹھکرائن حیران ہو کر بولیں۔''

''تمہیں سب کچھ تھوڑی دیر بعد خود ہی معلوم ہو جائے گا دنگ رہ جاؤ گی اپنی بیٹی کا فیصلہ سن کر۔''

ٹھکرائن زچ ہو کر بولیں۔ ''اب کچھ بتاؤ گے بھی یا بس یوں ہی تنگ کرو گے۔''

بڑے ٹھاکر کا سینہ کچھ اور چوڑا ہو گیا اور ایسا لگا کہ ان کی جھکی ہوئی کمر ایک دم سیدھی ہو گئی ہو شوبھا اپنا نشانہ کرتار پر آزمائے گی۔ ٹھکرائیں حیران رہ کر بولیں ''کیا''؟۔

''ہاں۔ یہ خود شوبھا کا فیصلہ ہے۔ اب اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ اس

ل غیرت جاگ گئی ہے۔ وہ کرتار کے جھوٹے پیار کو سمجھ چکی ہے۔'' ٹھاکر ابھی یہی ہہ پائے تھے کہ ایک شخص جھونپڑے میں داخل ہوا۔ اس کی صورت بہت ہیبت اک تھی۔ آدھا چہرہ بالکل جلا ہوا تھا قطعی سیاہ اور ایک آنکھ بھی چہرے پر نہیں تھی۔ یشانی سے لے کر ٹھوڑی تک جگہ جگہ سیاہ گوشت لٹک گیا تھا اور آدھا چہرہ بہت وبصورت تھا۔ یہ بڑی سی آنکھ اور گوری جلد یہ چہرہ کسی ایک آدمی کا معلوم نہیں ہوتا ھا۔ بلکہ ایسا لگتا تھا جیسے دو چہرے بیچ سے جوڑ دیئے گئے ہوں۔ اگر اسے سیدھی طرف سے دیکھا جاتا تو وہ نہایت خوبصورت جوان تھا۔ اگر بائیں طرف سے کوئی اسے دیکھتا تو بے حد بدصورت اور بھیانک لگتا۔

وہ آتے ہی بولا ''سردار کرتار! ایک بار مرنے سے پہلے شوبھا سے ملنے چاہتا ہے۔ اس کی یہ آخری خواہش ہے'' وہ کہتا ہے کہ بے شک مجھے گولی مار دو مگر صرف مرنے سے پہلے میری ایک خواہش پوری کر دو کہ مجھے شوبھا سے ملا دو۔ مرنے والے کی آخری خواہش کا احترام دینا کے ہر قانون میں کیا جاتا ہے۔ اور ہمارے قانون میں بھی اس کی گنجائش ہے۔ اگر سردار اجازت دیں تو اس کی یہ خواہش پوری کر دی جائے۔'' یہ کہہ کر وہ ہاتھ باندھ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا۔ بڑے ٹھاکر کی گرجدار آواز جھونپڑے میں گونجی ''گرنام۔ اس سے کہہ دو کہ اس کی یہ خواہش ضرور پوری کی جائے گی۔ مگر بڑے میدان میں جہاں شوبھا خود اپنے ہاتھ سے اسے گولی مار دے گی'' میں ذرا چونکا تو یہ شخص ہے وہ گرنام سنگھ جو میرا دست راست ہے اور جس کا تذکرہ رات رام سروپ

نے کیا تھا۔

میں اس شخص کو دیکھ کر کچھ زیادہ خوش نہ ہوا' اس لئے ذرا ناگواری ے
''اب تم جا سکتے ہو گرنام سنگھ تم نے بڑے ٹھاکر کا فیصلہ سن لیا یہی ہماری رائے
اس شخص نے اپنی ایک بڑی آنکھ سے میری طرف دیکھا اور میرے لہجے کی سخ
محسوس کر کے کچھ سٹپٹایا اور جھونپڑی سے نکل گیا۔

''بہتر ہے سردار'' وہ میرے آگے سر جھکا کر بڑی عقیدت کے سے ان
میں لوٹا تھا۔ بڑے ٹھاکر نے میرے سخت لہجے کو شاید کچھ اور ہی معنی دیئے اور بو
''رنجیتے کیا تو ہمارے فیصلے سے مطمئن نہیں' تیرے لہجے میں یہ ناگواری سی
ہے؟''۔

مجھے اب اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور ذرا سنبھل کر کہا' ''نہیں بابا...
ایسی کوئی بات نہیں ...... دراصل اس وقت گرنام سنگھ کو دیکھ کر مجھے ذرا ناگوا
ہوئی۔''

بڑے ٹھاکر بولے ''کیا مطلب؟ گرنام تو میرے اوپر جان چھڑکتا ہے
تو بھول گیا کہ ایک مرتبہ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر تجھے بچایا تھا
تیرے لئے جلتی ہوئی آگ میں کود پڑا تھا۔ پھر تجھے بچانے ہی کی خاطر یہ سا
آ گیا تھا اور بجائے اس کے دشمن کی اٹھتی ہوئی مشعل تیرے چہرے کو بھون د
اس نے اپنا چہرہ آگے کر دیا اور اپنی ایک آنکھ کے ساتھ آدھے چہرے سے محر
ہو گیا۔ نشانہ اتنا سچا ہے کہ آواز پہ گولی مارتا ہے۔ تجھے کل سے یہ کیا ہو گیا ہے؟ کچھ

ا نہیں ہوا کہ کسی اہم معرکے میں تو نے اسے اپنے ساتھ نہ لیا ہو۔ کل تم سب کے
انہ ہونے کے بعد میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تو گرنام سنگھ
اس مرتبہ اپنے ساتھ نہیں لیا'' یہ کہہ کر بڑے ٹھاکر سوالیہ نظروں سے میری طرف
یکھنے لگے اور میں اپنی غلطی اور لاعلمی پر جی ہی جی میں بہت شرمندہ ہوا۔ مجھے واقعی
ہیں چاہئے تھا'' میں نے اپنی خفت مٹانے کے لئے کہا۔

''بابا ...... دراصل رات بھر کی تھکن نے میری طبعیت کچھ بجھا دی ہے
مجھے واقعی گرنام سے اس طرح سخت لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی وہ میرا محسن
ہے آپ صحیح کہتے ہیں''۔

جب ہم اور بڑے ٹھاکر باتیں کر رہے تھے بڑی ٹھکرائن اور شوبھا اندر
ھونپڑے میں چلی گئی تھیں اور غالباً ناشتے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ تھوڑی ہی
ر بعد ناشتا آ گیا اور ہم سب نے مل کر ناشتا کیا۔ ناشتے کے دوران شوبھا نے ایک
یب حرکت کی۔ پوری کا ایک نوالہ میری طرف بڑھایا اور میرے منہ کے قریب لا
ر بولی۔

''لے کھا'' اور جب میں نے منہ کھولا تو نوالہ ہٹا لیا' اسی طرح اس نے کئی
عہ کیا اور میں نے جھنجھلا کر منہ آگے بڑھایا اور زبردستی اس کے ہاتھ سے پوری کا
والہ چھین کر کھا گیا، اس سے یہ ہوا کہ اس کی انگلی بھی میرے دانت کے نیچے آ کر
بی ہو گئی اور وہ ''سی سی'' کرتی ہوئی چیخ پڑی اور پھر مجھے بھی ایسی ہی سوجھی۔ میں
نے بھی نوالہ اس کی طرف بڑھایا اور اس نے پہلے ہی تلے میں اس سے بے نیاز ہو

کر میری انگلیوں کا کیا حشر ہوگا۔ پورا نوالہ جھپٹ لیا اور ساتھ ہی میری دوانگ
بھی چبا ڈالیں اور پھر بولی۔

''اب پتا چلا'' ہم دونوں کی اس بچکانہ حرکت پر بڑی ٹھکرائن اور بڑ
ٹھاکر نے ہمیں بزرگانہ شفقت کے ساتھ ڈانٹا۔ ''چپ چاپ۔ دونوں کھانا
ورنہ دونوں کے کان اکھاڑ لوں گا''۔

اس پر ٹھکرائن بولیں ''ہاں تمہیں تو میرے بچوں کو مارنے کا موقع
چاہئے۔ دیکھتے نہیں دونوں بہن بھائیوں میں کتنی محبت ہے بھگوان رکھے دو
آپس میں اتنی محبت کرتے ہیں کہ آج تک کسی بھائی بہن نے نہ کی ہوگی۔
ٹھکرائن کے اسا کہنے پر شوبھا ایک لمحے کے لئے کچھ مبہوت سی ہوگئی اور پھر نا
کرنے میں مشغول ہوگئی۔ اب وہ جانے کیوں چپ چاپ سر جھکائے ناشتا کر
تھی۔ وہ اس وقت بھی مجھے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ بہت سی نرم نرم گڑیا سی۔ ش
کیا تھی۔ بس ایک جادو تھی۔ اس کی ہرادا میں ایک بھولپن' ایک سادگی ایک سپر
ایک پیار اور نہ جانے کیا کیا ہوتا' جس پر میں دل و جان سے عاشق تھا۔

کتنی عجیب بات تھی کہ وہ دنیا کی نظر میں میری سگی بہن تھی اور میری
میں میری معشوقہ۔ کبھی کبھی میں اس خیال سے ہی لرز جاتا مگر یہ سوچ کر مطمئن
جاتا کہ میں علی حسن ہوں۔ رنجیت سنگھ تو صرف میرا ظاہر ہے اور بھی شاید عار
ظاہر۔ میں ابھی اسی سوچ میں تھا کہ گرنام سنگھ پھر جھونپڑے میں داخل ہوا۔ ا
مرتبہ اس کے ساتھ رام سروپ اور چرنجی بھی تھے جو اس سے دو قدم پیچھے ہا

باندھ کر کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کیا چرنجی کی خوفناک آنکھیں اس وقت
عقیدت سے میرے سامنے جھکی ہوئی تھیں کل کے واقعے نے اس کی نظر میں میری
عقیدت کافی بڑھا دی تھی اور گرنام سنگھ کے بارے میں تو میں جان ہی چکا تھا کہ میرا
جان نثار ہے وہ سر جھکا کر بولا۔

''سردار' تمام بستی کے لوگ میدان میں جمع ہو چکے ہیں اور کرتار کو ایک
ستون کے ساتھ باندھا جا چکا ہے۔ سورج بھی اب نکلنے ہی والا ہے۔ قانون کے
مطابق سورج نکلتے ہی مجرم کو گولی ماردینی چاہئے۔ اس لئے ہم سب آپ کے منتظر
ہیں اور پھر مرنے والے کی آخری خواہش کا بھی مسئلہ ہے۔'' ہم سب اس وقت تک
ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ بڑے ٹھاکر نے کہا۔ ''تم لوگ چلو ہم ابھی آتے
ہیں۔'' اور وہ سب ایک ساتھ سر جھکا کر جھونپڑے سے چلے گئے۔

بڑے ٹھاکر نے بندوق اٹھائی اور ایک گز سے اس کی نالیاں صاف
کرنے لگے پھر بندوق لوڈ کر کے انہوں نے شوبھا کے ہاتھ میں تھمادی۔ شوبھا نے
بڑے اعتماد سے اسے اپنے کاندھے پر ڈال لیا اور ہم سب یعنی بڑے ٹھاکر بڑی
ٹھکرائن' شوبھا اور میں گھوڑوں پر سوار ہو کر رات والے بڑے میدان کی طرف چل
دیئے جہاں رات ہی پانچ سپاہیوں کو گولی ماردی گئی تھی۔ کل رات اور آج صبح کے
درمیان میرے اندر بہت فرق ہو گیا تھا۔ رات مجھے اس عجیب غریب مظاہرے
سے یعنی پانچ آدمیوں کے خون سے ایک قسم کی نفرت سی ہوگئی تھی اور میں نے اپنے
دل میں اس فعل کو بہت بربریت سمجھا تھا مگر آج جب کہ یہی فعل دوبارہ دہرایا

جانے والا تھا۔ اور پانچ آدمیوں کے قاتل بڑے ٹھاکر میرے ساتھ ساتھ گھوڑ
پر دوڑ رہے تھے‘ مجھے ان سے کوئی نفرت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ ایک عجیب
خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں اپنے رقیب کو راستے سے ہٹا رہا تھا اور خود میری محبو
اسے میرے سامنے قتل کرنے والی تھی۔ اس وقت شوبھا ایک الگ گھوڑے پر سوار
کر رہی تھی‘ اس کے کاندھے سے بندوق لٹکی ہوئی تھی۔ وہ بندوق جو تھوڑی دیر بع
میرے رقیب کو اس دنیا سے رخصت کرنے والی تھی۔

اب ہم اسی خونی میدان میں تھے وہی منظر جو رات تھا۔ اس وقت بھی
بس اگر کچھ فرق تھا تو مشعلوں کا‘ اس وقت کیونکہ صبح تھی اس لئے مشعلیں نہیں تھی
باقی سب کچھ وہی تھا وہی نعرے‘ وہی ہجوم۔ بڑے ٹھاکر کی جے۔ رنجیت سنگھ
جے۔ شوبھا رانی کی جے۔ اپنی اور شوبھا کی جے۔ ساتھ ساتھ سن کر میرے دل
ایک عجیب‘ خوشگوار احساس ہوا...... ہم سب ان ہی نعروں کی گونج میں چبوتر
تک پہنچے۔ حسب توقع بڑے ٹھاکر کی تقریر شروع ہو چکی تھی۔ اس وقت وہ کہہ ر
تھے۔

’’تو اس طرح اس شخص نے ہم سب کے ساتھ غداری کی ہے‘ اس
علاوہ اس نے ایک جرم اور کیا کہ سزا سے بچنے کے لئے ہماری اور اس بستی کی ایک
عزت دار بیٹی شوبھا پر یہ الزام لگایا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور شوبھا بھی ا
چاہتی ہے۔ مگر یہ سب ایک ڈھونگ ایک جھوٹ تھا‘ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ خ
اس بستی کی وہ غیرت مند بیٹی۔ اس بزدل اور جھوٹے کو اپنے ہاتھ سے گولی مار

ل۔ مگر ٹھاکر کے ان الفاظ کے ساتھ ہی مجمع نے پھر خوشی سے نعرے لگائے اور میں
لے دور بندھے ہوئے کرتار کو دیکھا کہ اس کی گردن خود بخود جھک گئی ہے۔ بڑے
ٹھاکر کی کڑک دار آواز شاید اس تک بھی پہنچ چکی تھی۔ وہ ستون سے بندھا ہوا اس
قت ایسا لگ رہا تھا جیسے موت سے پہلے ہی مر چکا ہو۔ یہ اطلاع کہ اسے شوبھا خود
لی مارے گی اس کے لئے موت سے بھی بڑی خبر تھی۔ بڑے ٹھاکر کی آواز پھر
نجی۔

’’اس بزدل کی آخری خواہش یہ ہے کہ شوبھا ایک دفعہ اس سے مل لے۔
نے سے پہلے ہم اس کی یہ خواہش پوری کرتے ہیں۔ اور شوبھا کو حکم دیتے ہیں کہ
ہ اس بزدل کے پاس جائے اور اس کی بات سنے مگر......‘‘

اتنا سن کر مجمع سے ایک شور بلند ہوا اور شوبھا نے سامنے ستون سے
دھے ہوئے کرتار کی طرف دیکھ کر تھوک دیا۔ مگر شاید کرتار نے اسے ایسا کرتے
یں دیکھا‘ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی وہ بڑے ٹھاکر کے فقرے سن کر بہت زور
ے چیخا۔

’’انہوں نے شوبھا کو مجبور کر دیا ہے ورنہ شوبھا واقعی مجھ سے محبت کرتی
ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں نے شوبھا اور شوبھا نے مجھ سے سچی محبت کی
ہے‘‘۔ اتنا سننا تھا کہ شوبھا اپنی جگہ سے خود بخود اٹھی اور زور سے چیخ کر بولی۔ وہ
اس وقت غصے سے کانپ رہی تھی۔

’’یہ شخص جھوٹا ہے‘ بزدل اور کمینہ ہے‘ اپنی موت کو سامنے دیکھ کر اس کے

اوسان جواب دے چکے ہیں۔ یہ پاگل ہوگیا ہے۔ یہ غدار ہے۔ میں نے اس
کبھی محبت نہیں کی۔'' مگر اس کا دوسرا فقرہ بہت خطرناک تھا۔ اتنا خطرناک کہ
بھی ایک دفعہ اس کی طرح کانپ اٹھا۔ مگر میرے اور اس کے کانپنے میں فرق
غصے سے کانپ رہی تھی اور میں خوف سے۔ اس نے کہا تھا۔

''میں نے اس بزدل سے نہیں رنجیت سے محبت کی ہے سچی محبت ا
بھی مجھے اسی طرح چاہتا ہے''۔ یہ فقرہ میرے اوپر بجلی بن کر گرا' اور باقی تمام
بھی کچھ دیر کے لئے مبہوت سے ہوگئے۔ شوبھا نے یہ کیا کہہ دیا مگر اس فائ
شاید سبھی کو چونکا دیا۔ شوبھا نے اپنا فقرہ ختم کرتے ہی کرتار کو گولی ماردی تھی
فائر اور مرنے والے کی آخری چیخ سے چونک پڑے۔ اس نے مرتے مرتے
شوبھا کہا تھا اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ گولی شاید عین دل پر لگی تھی
کی آخری چیخ اور آخری لفظ اس کی صداقت کے گواہ تھے مگر اس کی سچائی کو مح
کرنے والا یہاں شاید کوئی نہیں تھا مگر نہیں ایک شخص یہاں ایسا بھی موجود ت
کرتار اور شوبھا کے سچے عشق سے واقف تھا اور وہ میں تھا۔ جس نے جذبہ رق
میں شوبھا کے ذہن کو اپنی پراسرار قوتوں سے تبدیل کر دیا تھا اور اس کے دل
بجائے کرتار کے اپنی محبت پیدا کر دی تھی۔ ایسی محبت' اتنی شدید محبت جس نے
سے اس بھرے مجمعے میں اپنا اظہار کرالیا۔ شوبھا بندوق رکھ کر چبوترے پر بیٹھ
تھی۔ بڑے ٹھاکر پھر کھڑے ہوئے اور انہوں نے مجمع کے سکوت کو اپنی پاٹ
آواز سے توڑا۔

''آپ لوگ شاید اب جان چکے ہونگے کہ شوبھا کو کرتار سے کوئی محبت
ہیں تھی اور کیونکہ کرتار نے تمہارے سردار رنجیت سنگھ کی سر کی قمت جو ہم سب کو پتا
ہے کہ حکومت نے بیس ہزار مقرر کی ہے وصول کرنی چاہی تھی۔ شوبھا کے دل میں
نہارے سردار اور اپنے بھائی۔ رنجیت سنگھ کی محبت تھی۔ اس لئے اس نے اپنے
بھائی کی محبت سے مجبور ہو کر خود کرتار کو گولی مارنا پسند کیا۔ کرتار اپنی سزا کو پہنچا۔
رنجیت بھی اپنی بہن کو اسی طرح چاہتا ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے''۔

بڑے ٹھاکر کی اس تقریر سے لوگ مطمئن ہوئے اور متاثر ہو کر شوبھا رانی
کی جے بولنے لگے۔ میرے دل کو بھی کچھ سکون ہوا مگر بڑے ٹھاکر کی تقریر کے بعد
شوبھا نے کچھ کہنے کے لئے اٹھنا چاہا، میں اس کے برابر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے
جب یہ محسوس کیا کہ وہ اٹھ کر پھر کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھدیا
تاکہ وہ اٹھ نہ سکے اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے کہا۔

''بس اب کسی تقریر کی ضرورت نہیں''۔

میرے کہنے پر وہ مان گئی اور تھوڑی دیر کے بعد تمام مجمع منتشر ہونے لگا
۔ کرتار کی لاش کے لئے بڑے ٹھاکر کا حکم تھا کہ اسی طرح ستون سے بندھی رہے گی
تاکہ دیکھنے والوں کو عبرت ہو کہ مخبر اور غدار کا انجام کیا ہوتا ہے؟۔

وہ رات اور وہ صبح عجب تھکا دینے والی تھی۔ میں رات بھر کا جاگا اور تھکا
ہوا تھا اور شوبھا بھی اس لئے ہم دونوں اپنے جھونپڑے میں پہنچتے ہی پیال دار نرم
نرم بستروں پر گر کر ایک دم سو گئے میری آنکھ جس وقت کھلی شام ہو چکی تھی۔ اندر کا

جھونپڑا قطعی خالی تھا اور دروازے پر پردہ لٹکا ہوا تھا۔ باہر کے حصے میں بھی شاید کو
نہیں تھا۔ میں نے تصدیق کرنے کے لئے پردہ اٹھا کر باہر کی طرف جھانکا اور
پیال دار بستر پر آ کر لیٹ گیا میں نے اپنی سیدھی طرف دیکھا۔ شوبھا ابھی بے
پڑی سو رہی تھی۔ عجیب عجیب مست مست اور بکھری بکھری سی۔ چہرہ زلفوں سے
ڈھکا ہوا تھا میں بستر سے اٹھا اور اس کے چہرے سے زلفیں ہٹا دیں۔ اس کے سی
کے اتار چڑھاؤ نے مجھ میں ہلچل مچا دی اور میرے ہونٹ خود بخود اس کے پھو
سے رخساروں سے چپک گئے میں چونکا یہ آہٹ کیسی ہوئی پیچھے مڑ کر دیکھا تو لا
کھڑی تھی۔ وہ بولی۔

''بہت چاہتے ہو اپنی بہن کو'' اس نے بھی تو آج بھرے مجمع میں تمہار
محبت کا اقرار کیا ہے۔ اس نے واقعی تمہارے لئے بہت بڑی قربانی دی ہے میں ا
کی رازدار ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ کرتار کو بے انتہا چاہتی تھی اتنا کہ ا
کے بغیر اس کا زندہ رہنا مشکل تھا۔ مگر نے بھائی بہن کی محبت کی وہ مثال قائم کی ہے
جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں سنی تم نے آخر اس پر کیا جادو کر دیا کہ اس نے خو
اپنے ہاتھ سے اپنے عاشق کو گولی مار دی؟...... عجیب لڑکی ہے یہ بھی''۔

میں نے لاجو کے الفاظ سنے وہ اس وقت بہت اچھی لگی تھی اور پیلی ساڑ
میں اس کا رنگ کھل رہا تھا وہ میری نظریں شاید بھانپ گئی۔ بولی۔

''کوئی شرارت نہ کرنا' کہیں شوبھا جاگ جائے'' اس نے یہ جملہ اس
طرح ادا کیا کہ مجھے اور نشہ ہو گیا میں نے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا اور اس سے

ہلے کہ اسے پیار کرتا وہ کسمسائی اور آہستہ سے بولی ''دیکھو وہ جاگ گئی'' اور میں
نے یہ سنتے ہی اسے چھوڑ دیا۔

''نکل جا یہاں سے بے غیرت کہیں کی۔ دوسرے کے مال پر ہاتھ صاف
کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی'' یہ آواز شوبھا کی تھی جو انتہائی غصے کی مظہر تھی۔
جو اس کی آواز سن کر حیران سی رہ گئی۔ کیا یہ وہی شوبھا تھی جو اسے اور رنجیت کو تنہا پا
کر پڑوس میں بھاگ جاتی تھی۔ لاجو نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

''شوبھا کیا ہو گا ہے تجھے؟ کیا تو کرتار کو اپنے ہاتھ سے گولی مار کر پاگل
ہو گئی ہے؟''۔

شوبھا نے غضب ناک ہو کر ''میں پاگل نہیں ہوئی لاجو تیری عقل پر پتھر پڑ
گئے ہیں اگر میں نے اب تجھے رنجیت سے اس طرح بات کرتے دیکھ لیا تو دونوں کو
گولی مار دوں گی سمجھی کہ نہیں''۔

میں نے بیچ میں بولنا چاہا ''سنو شوبھا! آخر وہ میری منگیتر ہے۔ تمہیں اس
طرح اس کی توہین نہیں کرنی چاہیئے''۔

شوبھا چیخ کر بولی ''تم چپ رہو' میں کچھ نہیں جانتی اگر میرے علاوہ تمہیں
کسی نے چاہا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی''۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے لاجو نے
خیال کیا کہ شاید کرتار کے صدمے نے اس کے ہوش و حواس معطل کر دیئے ہیں۔
اس لئے بولی۔

''ابھی تم آرام کرو' تمہیں آرام کی بے حد ضرورت ہے...... تمہاری

طبعیت کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی''۔

''تیری بلا سے میں مروں یا جیوں۔ مگر تو اب یہاں قدم نہیں رکھے گی
لاجو نے شوبھا کا یہ فقرہ سنا اور ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے دو آنسو گرے۔''ا
اب میں یہاں کبھی نہیں آؤں گی کبھی نہیں یہ کہتے ہوئے وہ میرے لاکھ روکنے
جھونپڑے سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے شوبھا سے کہا۔

''تمہیں کیا ہوگیا ہے شوبھا آخر کوئی بات بھی ہو' تم نے ناحق اسے تکلیف
پہنچائی''۔

اس نے پھر خفگی سے کہا'' رنجیتے میں تجھے چاہتی ہوں' ایک میان میں
تلواریں نہیں رہ سکتیں'' یہ کتنی عجیب بات تھی کہ کل ہی میں نے اس سے یہ فقرہ کہا
اور وہ آج مجھ سے وہی فقرہ کہہ رہی تھی۔ مجھے شوبھا کی یہ انتہا پسندی کچھ زیادہ اچھی
نہ لگی، مگر میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

اس عرصے میں بڑے ٹھاکر اور بڑی ٹھکرائن بھی آ گئے بڑے ٹھاکر نے
آتے ہی کہا'' کیونکہ پولیس نے ہمارے آدمیوں کو نہیں چھوڑا۔ اس لئے میں
بقیہ پانچ سپاہیوں کو بھی ٹھکانے لگا دیا اور آج رات پھر ان کی لاشیں تھانہ گڑوال
پہنچائی جانی چاہئیں میں سمجھتا ہوں کیونکہ تم کل رات کے تھکے ہوئے ہو آج یہ کا
گرنام سنگھ کرے گا' تمہارا کیا خیال ہے؟۔

میں نے کہا'' بالکل صحیح ہے مگر آج کل سے زیادہ خطرہ ہے' اس لئے
پولیس ہمارے ارادوں سے واقف ہے کہ ہم آج رات بقیہ لاشیں لائیں گے آ

ج لیجئے'' میرے یہ کہنے میں ڈھکی چھپی ہر خواہش پنہاں تھی کہ آج رات بھی مجھے
نکلنے کا موقع مل جائے تا کہ کل کی طرح پھر وہی باغ اور شوبھا ہو''۔

بڑے ٹھاکر بولے۔'' یہ بھی تم صحیح کہتے ہو، ویسے ہمارے آدمی اب بھی
انہ گڑوال سے لے کر یہاں تک ٹکڑیوں کی صورت میں پھیلے ہوئے ہیں یہ لوگ
ئ صبح ہی سے اس تمام علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں تا کہ اگر پولیس ہمارے
امیوں کو چھوڑ دے تو ان کا پیچھا کرنے والوں کو صاف کیا جا سکے مگر میری سمجھ
ل نہیں آتا کہ پولیس نے ہمارے آدمی کیوں نہیں چھوڑے۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ
ما اپنے پانچ سپاہیوں کی لاشیں دیکھ کر ڈر جائیں گے اور بقیہ پانچ کی زندگیوں کے
لے ہمارے پانچ آدمیوں کو رہا کر دیں گے' مگر نہ معلوم ایسا کیوں نہیں ہوا۔

ابھی ٹھاکر اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ دور سے کچھ فائرنگ کی آوازیں آنا
راع ہو گئیں ہم سب چونک پڑے اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے
لگے۔ اسی وقت گرنام سنگھ بھاگتا ہوا جھونپڑے میں داخل ہوا اور آتے ہی پھولی
ہوئی سانس کے ساتھ کہنا شروع'' سردار ' غضب ہو گیا' پولیس ہمارے ٹھکانے
ا پہنچ گئی وہ بہت بھاری تعداد میں ہیں اور ان کے پاس...... وہ ابھی اتنا ہی کہہ
ا تھا کہ بہت زور سے دھماکا ہوا۔ آپ نے سنا...... سردار ان کے پاس گولے بھی
ہیں۔ یہ اسی کی آواز تھی انہوں نے گولے مار مار کر ہمارے خفیہ راستے کو اڑا دیا ہے
اور اس سے وادی میں اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں ہمارے آدمی ڈٹ کر
ان کا مقابلہ کر رہے ہیں مگر وہ بہت بھاری تعداد میں ہیں۔ میرا خیال ہے سردار

آپ بڑے ٹھاکر، اور بڑی ٹھکرائن مع شوبھا کے پچھلے خفیہ راستے سے فر
جائیں۔ اتنی دیر ہم کوشش کرتے ہیں کہ وہ وادی میں داخل نہ ہوسکیں‘‘۔

اس کا یہ کہنا تھا کہ جسے بڑے ٹھاکر چیخ پڑے۔ کیا بکتا ہے گرنام‘ ہما
پرکھوں کی روحوں کو شرماتا ہے۔ ہم میدان سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں
ناممکن......ایسا نہیں ہوسکتا......شوبھا کی ماں میری بندوق دو‘‘۔

گرنام سنگھ پھر گڑگڑایا ’’سردار! بڑے ٹھاکر جذبات میں بہہ رہے ہ
بھگوان کے لئے آپ نکل جایئے۔ ہماری سب کی جانیں آپ سے زیادہ قیمتی
ہیں‘‘۔

میں عجب شش و پنج میں تھا میرے اوپر اس وقت سینکڑوں سوال ح
رہے تھے مجھے کیا کرنا چاہئے...... مجھے کیا کرنا چاہئے آخر کار میں نے فیصلہ کی
ہمارا اس طرح بھاگنا کسی طرح مفید نہیں ہے اور کیا خبر کہ ہم جس راستے سے فرا
نے کی کوشش کرنا چاہتے ہوں، وہاں بھی پولیس موجود ہو۔ میں نے یہی سو
گرنام سے کہا۔ ’’نہیں گرنام ہم اپنے ساتھیوں کو اس حالت میں چھوڑ کر
بھاگ سکتے۔ تم صرف اتنا بتادو کہ پولیس کی کمان کون کررہا ہے؟‘‘ گرنام کا جو
تھا ’’خود آئی جی پولیس‘‘ میرے ذہن میں ایک ترکیب آچکی تھی۔

میں نے گرنام سے کہا ’’کیا یہ ممکن ہے کہ میں خفیہ راستے سے ہوکر ا
جیپ تک پہنچ سکوں؟ پوزیشن کیا ہے مجھے سمجھاؤ‘‘

گرنام بولا ’’اگر آپ خفیہ راستے سے جائیں گے تو یہ عین ان کی پشت

پ کو پہنچادے گا مگر آئی جی کی جیپ تک پہنچنا بہت جان جوکھوں کا کام ہے سردار‘‘
یہ کہہ کر پھر خاموش ہوگیا۔ مگر تم وہاں تک پہنچ کر کرنا کیا چاہتے ہو؟‘‘ ’’یہ مجھ پر
ز دیجئے بابا۔ مگر وہاں تک پہنچنا بہت ضروری ہے اور اگر میں وہاں تک پہنچ گیا تو
چ جائیں گے گرنام تم مجھے پچھلے خفیہ راستے سے چھوڑ کر یہاں واپس آؤ گے اور
ب تم میری فائر کی آواز سنو گے......‘‘ گرنام نے بات کاٹ کر کہا ’’مگر سردار میں
پ کے فائر کی آواز کو کس طرح پہچانوں گا‘‘۔

میں نے کہا ’’تم سنو تو! جب تم دیکھو کہ پولیس نے ہتھیار ڈال کر ہاتھ
ا اٹھا دیئے ہیں اور کوئی فائرنگ نہیں ہورہی اس کے بعد تم ایک فائر کی آواز سنو تو
آدھے جوانوں کو لے کر پچھلے خفیہ راستے سے آجاؤ گے اور آدھے جوان سامنے
پولیس کو گھیریں۔ تم سمجھ گئے؟‘‘۔

’’بڑے ٹھاکر نے پھر بیچ میں دخل اندازی کی۔ مگر رنجیتے یہ کس طرح ہوسکتا
ا پولیس ہتھیار ڈال دے‘‘۔

اس پر گرنام سنگھ بھی بولا۔ اور پھر وہ ہم سے دوگنی تعداد میں ہیں اور اسلحہ
ہم سے زیادہ ہے۔

میں نے سختی سے کہا؟؟ تم یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو‘ فائروں کی اور
وں کی آوازیں اب بھی آرہی تھی میں گرنام سنگھ کو لے کر پچھلے خفیہ راستے سے
رہا تھا یہ راستہ بھی بالکل سامنے والے راستے کی طرح تھا ہم نے راستہ طے کیا
نام کو اپنے ساتھ اس لئے لایا تھا کہ مجھے علم ہو جائے کہ پچھلا خفیہ راستہ کدھر

ہے ورنہ ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی میں نے راستے کے آخر تک پہنچ کر
سے کہا ''اچھا اب تم واپس جاؤ' میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔ بلکہ ایسا کرو ا
سے کچھ آدمی اس راستے سے باہر نکالنا شروع کردو'۔

میری بات سن کر وہ بولا۔ ''یہ خطرناک ہے سردار سامنے سے اگر آد
کیے گئے تو پولیس ہم پر حاوی ہو جائے گی...... ابھی تو مقابلہ برابر چل رہا ہے
بھگوان نہ کرے اگر آدھے آدمی سامنے سے ہٹا لئے تو ہم ہار مان جائیں گے۔
نے کہا'' تم ٹھیک کہتے ہو گرنام۔ پھر یہی ٹھیک ہے کہ جیسے ہی تم دیکھو پولیس
ہتھیار ڈالنا شروع کر دیئے ہیں پچھلے راستے سے آتے ہی انہیں گھیر لو اور خا
کے ساتھ آدھے آدمی سامنے سے الگ ہو جاؤ تم سمجھ گئے؟'' اس نے کہا''
سردار' بالکل بھگوان آپ کی مدد کرے''۔ یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا اور میں دیوا
لگے ہوئے ایک کڑے پر زور آزمائی کرنے لگا جو غالباً کافی عرصے سے اس
نہیں ہوا تھا۔ اس غار نما سرنگ میں بھی راستے کے آخر میں پہلے راستے جیسا
کڑا دیوار پر لگا ہوا تھا ایک لمحے میں میں نے سوچا کہ اگر راستہ نہ کھلا تو کیا ہو
ذرا زور صرف کرنے پر ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ سامنے راستہ نمودار ہو گیا۔
جیسے ہی غار نما سرنگ سے باہر نکلا' وہ راستہ خود بخود بند ہو گیا۔ اب میں اسی ط
کے ایک تنگ سے درے میں تھا جیسا اس وادی کے دوسری سمت میں تھا۔
فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں خاصی تیز ہو گئی تھیں۔ میں نے جلدی ہی درہ
لیا سامنے ایک اونچی سی چٹان تھی مگر اس پر چڑھنا کچھ ایسا دشوار نہیں تھا اس لئے

وہ بتدریج اوپر کی طرف سے اونچی ہوتی چلی گئی تھی اور اونچائی بھی کسی قدر کم ہی تھی
میں اس چٹان پر سنبھل سنبھل کر چڑھنے لگا جیسے ہی میں نے چٹان کے اوپر پہنچا۔
مجھے کوئی دس پندرہ ٹرک دکھائی دیئے اور ان کے پیچھے ایک جیپ۔ سپاہیوں نے جو
ٹرک کے اندر اور نیچے موجود تھے ٹرکوں کی ایک دیوار سی بنالی تھی۔ فائرنگ برابر
جاری تھی کبھی ادھر سے اور کبھی ادھر سے چیخوں کی آواز سنائی دیتی۔ ان ٹرکوں کی
دیوار سے ذرا پیچھے ایک جیپ پر ایک شخص دوربین لئے ذراہٹ کر کھڑا تھا اس کے
ایک ہاتھ میں رائفل تھی جس سے کبھی کبھی وہ نشانہ لیتا اور فائر کرتا۔ اس وقت
دوربین اس کے گلے میں لٹک جاتی اور اسی طرح پھر وہ دوربین سے دیکھنے لگتا اور
دوربین سے دیکھنے کے بعد وہ پاس ہی رکھا ہوا ایک مائک اٹھاتا اور سپاہیوں کو
ہدایات دیتا ان سب کی پشت میری طرف تھی میں نے سوچا تو یہ ہے آئی جی۔ اتفاق
سے وہ جیپ میں تنہا تھا میں سینے کے بل چٹان پر لیٹ کر نیچے کھسکنے لگا چٹان سے
ٹرکوں کی دیوار اور اس جیپ کا فاصلہ مشکل سے کوئی سو ڈیڑھ سو گز ہو گا میں اس سمت
تیزی سے سینے کے بل رینگنے لگا جس طرف وہ جیپ کھڑی تھی میں رفتہ رفتہ اس سے
قریب سے قریب تر ہوتا جارہا تھا میں جیسے ہی جیپ کے قریب پہنچا اس شخص کو شاید
میری موجودگی کا علم ہو گیا اور وہ ایک دم چونک کر مڑا۔ مجھے بھی اس کیفیت کا
احساس ہو گیا۔ وہ میری موجودگی سے باخبر ہو چکا ہے۔ میں اس کی جیپ کے نیچے
رینگ گیا۔ مجھے اپنی نازک پوزیشن کا احساس ہو چکا تھا۔ مگر اب سوائے اس کے
اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں جیپ کے نیچے رینگ جاؤں۔ دوسری بات یہ کہ میں نہتا

بھی تھا۔ میرے پاس بندوق بھی نہیں تھی۔ وہ شخص نیچے جھک کر جھانکنے لگا۔ اتفاق یہ کہ اس نے جس طرف جھانکا اسی سمت میں میرا بھی چہرہ تھا، جیسے ہی اس نے میری طرف دیکھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اور اپنے ذہن سے اس کے ذہن کو حکم دینے لگا۔ کیونکہ اب اس کا ذہن میرے قابو میں تھا۔ میرے آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی اسے ایک جھٹکا لگا اور یوں ہی جھکا جھکا رہ گیا میں نے جلدی سے اسے حکم دیا۔

''تم اب یہ بھول کر کہ تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے' جیپ پر دوبارہ چڑھو گے اور مائک سے اپنے تمام ساتھیوں کو یہ حکم دو گے کہ وہ ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھائے ٹرکوں کے دوسری طرف چلے جائیں تم یہ بھی کہو گے کہ ہمیں چاروں طرف سے ڈاکو رنجیت سنگھ کے آدمیوں نے گھیر لیا ہے، اس لئے مقابلہ بیکار ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد تم یہ بھول جاؤ گے کہ تم سے یہ کام زبردستی کرایا گیا ہے۔ بولو؟''۔

اس کا ذہن کا جواب تھا ''مگر اس طرح تو ہم سب مارے جائیں گے ......نہیں یہ ناممکن ہے' میں اپنے بڑوں کو کیا جواب دوں گا؟'' میں نے پھر سختی سے اپنی بات کو دہرایا اور زور دے کر کہا .... نہیں تم مارے نہیں جاؤ گے اور تمہیں ایسا ہی کرنا پڑے گا اس میں تمہاری بھلائی ہے''۔

اس مرتبہ اس کے ذہن کا جواب تھا ''نہیں چاہے تم مجھے جان سے مار دو میں اپنے سپاہیوں کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتا'' یقیناً وہ ایک طاقت ور ذہن کا مالک تھا میں نے اس کا ذہن جھنجوڑ دیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سے کراہ نکلی۔

میں نے کہا ''اب بولو۔ تم راضی ہو؟''

اس کے منہ سے پھر ایک لمبی آہ نکلی۔ اب اس کا جواب تھا

''میں تیار ہوں''۔

اس ذہنی جنگ سے میرے بھی ذہن میں شدید درد ہونے لگا میں نے اس کی آنکھوں سے آنکھیں ہٹا لیں۔ وہ چپ چاپ جیپ پر چڑھا اور اعلان کرنے لگا۔ اب کچھ میرے سر کا درد ختم ہوا۔ جس وقت میں اس کے ذہن کو اپنے قابو میں کئے ہوئے تھا مجھے بھی ایسا کرتے ہوئے خاصی تکلیف ہو رہی تھی۔ مائک سے اس کی آواز آرہی تھی۔

''تم سب اپنے ہتھیار فوراً پھینک دو' یہ میرا حکم ہے' تمہارے آئی جی کا حکم ۔ ہم چاروں طرف سے گھر چکے ہیں۔ بہتری اسی میں ہے کہ ہم ہتھیار پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لیں۔ تم سب ہاتھ اوپر اٹھائے ٹرکوں کی دیوار کے دوسری طرف جلد از جلد چلے جاؤ۔ اس کے اعلان پر ایک دم فائرنگ بند ہو گئی اور وہ سب اپنے ہتھیار پھینکنے لگے۔ مگر سامنے سے فائرنگ اب بھی جاری تھی۔ وہ سب اس کی پرواہ کئے بغیر کہ سامنے سے فائرنگ برابر جاری ہے اپنے آئی جی کے حکم پر ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھائے ٹرکوں کی اوٹ سے نکل کر دوسری طرف جا رہے تھے۔

مجھے اپنے ساتھیوں پر سخت غصہ آرہا تھا جو ان لوگوں کے ہتھیار ڈالنے کے باوجود اپنی فائرنگ نہیں بند کر رہے تھے۔ میں اب جیپ کے نیچے سے رینگ کر باہر آچکا تھا اور جیپ پر آئی جی کی پشت کی طرف سے چڑھ رہا تھا۔ آئی جی جواب اپنے

حکم کی تعمیل ہوتے دیکھ کر رائفل پھینک کر خود بھی جیپ میں ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ میں نے آہستہ سے آئی جی کی رائفل اٹھائی جو اس نے جیپ ہی میں پھینک دی تھی رائفل لوڈ تھی۔ میرے ساتھیوں کی طرف سے فائرنگ اب بھی ہو رہی تھی اب وہ بے دھڑک سامنے ہاتھ اٹھائے آنے والے سپاہیوں کو بھون رہے تھے میں اس وقت ایک عجیب الجھن اور کوفت میں مبتلا تھا۔ میرے ذہن میں ایک اچانک ترکیب آئی اور میں نے پاس پڑا ہوا مائک اٹھالیا جیپ سے کچھ دیر پہلے آئی جی سپاہیوں کو ہدایت دے رہا تھا۔ اب میں اسی مائک کو پکڑے کہہ رہا تھا'' رام سروپ چرنجی' فائرنگ بند کر دو۔ پولیس نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں فائرنگ فوراً بند کر دو'' میری آواز سنتے ہی فائرنگ بند ہوگئی اور فائرنگ بند ہوتے ہی میں نے رائفل سے ایک ہوائی فائر کیا۔ یہ اشارہ گرنام سنگھ کے لئے تھا جسے آدھے آدمی لے کر پیچھے خفیہ راستے سے پولیس کے آدمیوں کو گھیرنا تھا میں نے دیکھا کہ سامنے سے کچھ لوگ تیزی کے ساتھ خاموشی سے پیچھے لوٹ رہے ہیں میں نے آئی جی کے گلے میں پڑی ہوئی دوربین اتار لی اور اس سے اپنے لوگوں کی نقل و حرکت دیکھنے لگا۔ جیپ اس پوزیشن میں تھی کہ سامنے کھڑے ہوئے ٹرک سامنے دیکھنے میں رکاوٹ نہیں بن رہے تھے۔ میں نے رائفل دوبارہ لوڈ کی اور آئی جی کی پشت پر اس کی نال رکھ دی اب میں نے دیکھا کہ وہ ایک 30`35 سال کا ایک خوبرو جوان تھا۔

تھوڑی دیر میں مجھے اپنے پیچھے ایک شور سنائی دیا یہ گرنام سنگھ اور اس کے ساتھی تھے۔ وہ جیپ تک آگئے۔ میں نے گرنام سنگھ کو حکم دیا کہ آئی جی کو اپ

سنبھالو باقی جتنے سپاہی زندہ ہیں انہیں باندھ لو کارروائی شروع ہوگئی میں جیپ سے اترا دیکھا کہ اب سامنے سے بھی لوگ بندوقیں تانیں بڑھ رہے ہیں۔ پولیس والوں کو دونوں طرف سے گھیر لیا گیا تھا اور اب حلقہ تنگ سے تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

میں آئی جی کی رائفل اپنے کاندھے پر ڈالے اب ٹرکوں کی دیوار طے کر چکا تھا۔ اب جو میں نے سامنے کی طرف نظر کی تو نہ وہ درہ دکھائی دیا اور نہ سامنے والی چھوٹی پہاڑی جس کے نیچے سے وہ خفیہ غار نما سرنگ جاتی تھی۔ وہ سرنگ ملبے کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میرے سامنے لاشیں ہی لاشیں پڑی تھیں جن کے درمیان سپاہی ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے میں ان لاشوں اور ملبے سے گزرتا ہوا گول وادی میں داخل ہو گیا۔ ادھر بھی کچھ کم نقصان نہیں ہوا تھا مگر یہاں لاشیں میدان سے کم تھیں اس لئے کہ یہ لوگ پھر بھی چٹانوں اور بڑے بڑے پتھروں کی آڑ میں تھے اور پولیس والے ایک دم کھلے میدان میں اس لئے پولیس والوں کا جانی نقصان زیادہ ہوا تھا۔

میں جیسے ہی جھونپڑوں کے درمیان آیا۔ دیکھا کہ سامنے سے ایک گھوڑا دوڑتا ہوا چلا آرہا تھا یہ بڑے ٹھاکر تھے جو غالباً میری تلاش میں روانہ ہوئے تھے انہیں کے ساتھ پشت پر شوبھا بھی بیٹھی تھی کسی ہرنی کی طرح چاق و چوبند اس کے ہاتھ میں بڑے ٹھاکر کی بندوق تھی۔ مجھے دیکھ کر بڑے ٹھاکر اور شوبھا گھوڑے سے اتر آئے گھوڑے سے اترتے ہی شوبھا میری طرف لپکی اور میرے رخساروں اور پیشانی پر بوسوں کی بوچھار کر دی۔ میں بڑے ٹھاکر کی موجودگی سے بہت خفیف ہوا

مگر وہ باز نہ آئی۔ یہاں تک کہ مجھے خود اسے اپنے سے الگ کرنا پڑا۔ وہ کہہ ر
''تو زندہ ہے رنجیتے! ورنہ میں ایک ایک سپاہی کو بھون کر رکھ دیتی'' بڑے
نے جب اسے میرا نام لے کر جذباتی لہجے میں بات کرتے ہوئے دیکھا تو ج
دیا ''تجھ سے بڑا ہے یہ شوبھا۔ تجھے اس طرح اس کا نام نہیں لینا چاہئے''۔
وہ اکڑ کر بولی۔ تو کیا ہوا ' ہے تو میرا'' میں نے یہ محسوس کر کے یہ بات بڑ
جائے جلدی سے کہا'' چلئے بابا آپ جھونپڑے چلئے میں اسے لے کر آتا ہوں''
بڑے ٹھاکر ذرا ہچکچائے اور بولے'' مگر مجھے بتا تو سہی رنجیتے۔ یہ سب
ہوا کس طرح؟ مجھے تو خبر ملی تھی کہ ہم پسپا ہو رہے ہیں پھر یہ ایک دم کیسے پانسا
گیا؟ تیرے جانے کے بعد میں بہت پچھتایا کہ ناحق تو نے موت کے منہ
چھلانگ لگا دی ہے' آخر کچھ بتا تو' تو نے اس آئی جی کو کس طرح زیر کیا اور کیسے
کیا کہ وہ اپنے سپاہیوں کو یہ حکم دے دے کہ ہتھیار ڈال دو''۔ بڑے ٹھاکر یہ
کچھ جاننے کے لئے بہت بے چین تھے' مگر میں نے انہیں فی الحال ٹال دیا''
چلئے تو بابا' سب کچھ بتا دوں گا'' میں ان سے جھوٹ بولنے اور بات گھڑنے کے
کچھ وقت لینا چاہتا تھا میں ان پر اپنی پراسرار قوتوں کا اظہار تو کر ہی نہیں سکتا
میری بات سن کر وہ گھوڑے پر بیٹھ کر یہ کہتے ہوئے روانہ ہو گئے'' تیری ماں فکر
ہے' فوراً پہنچنے کی کوشش کرنا کہ اس کی ڈھارس بندھے''۔
''ہوں تو تو ایک سپاہی کو بھون دیتی؟ میں نے بڑے ٹھاکر کے جا
کے بعد شوبھا کی ٹھوڑی پکڑ کر کہا'' کیوں؟'' اور وہ میرے اس سوال پر کچھ جھ

ی گئی اور شرما کر گردن جھکا لی اور آہستہ سے نیچی نظر کر کے بولی۔ ''رنجیتے میں
تیرے بنا جی نہیں سکتی''۔ وہ ابھی یہی کہہ پائی تھی کہ گلی میں ایک شور سا ہوا لوگ شاید
کسی زخمی کو چارپائی پر ڈال کر لا رہے تھے وہ چارپائی ہمارے قریب آئی۔ اور میں
نے جب اس پر نظر کی تو ایک دم گم سم سا رہ گیا۔ یہ لاجو تھی میری منگیتر۔ میں نے
بار پائی اٹھانے والوں میں سے ایک کو پہچان لیا۔ یہ گرنام سنگھ تھا۔ گرنام سنگھ اور
جو کی چارپائی اٹھائے ہوئے۔ اس وقت وہ بہت غم زدہ لگ رہا تھا اور اس کی
یل واحد آنکھ بھی شاید ڈبڈبا رہی تھی۔

میں چارپائی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور گرنام سنگھ سے بولا۔ ''اے کیا
ا۔ گرنام سنگھ؟''۔

''یہ میری لاعلمی میں ماں سے آنکھ بچا کر بندوق لئے اگلے موروچوں تک پہنچ
ا تھی۔ یہ گرنام سنگھ کا جواب تھا۔

''مگر کیوں؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

''جب اسے معلوم ہوا کہ سردار نے موت کے منہ میں چھلانگ لگا دی ہے
ا اس وقت دشمنوں کی طرف روانہ ہو گئے ہیں پچھلے خفیہ راستے سے۔ تو یہ پہلے تو
ہلے خفیہ راستے کی طرف چلی۔ مگر راستہ کیونکہ ہمارے داخل ہوتے ہی خود بخود بند
یا تھا یہ وہاں سے ناکام واپس لوٹ کر سامنے والے مورچے کی طرف بھاگی اور
ل فائرنگ کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ مجھے اس کی اطلاع اس وقت ملی جب
پ رائفل سے اشارتی فائر کر چکے تھے میں اپنے ساتھیوں کو لے کر پچھلے خفیہ
تے سے بھاگا۔ مجھ سے راستے میں کئی جوانوں نے کہا بھی کہ تمہاری بہن سخت

زخمی ہے مگر میرے لئے آپ کا حکم پہلے ضروری تھا۔'' یہ کہہ کر گرنام سنگھ کی آ
وہ رکا ہوا آنسو اس کے سرخ رخسار پر بہنے لگا اور میں ایک عجیب ہی فضا میں
اور سوچنے لگا۔ تو یہ لڑکی مجھے اتنا چاہتی تھی کہ اپنی جان خطرے میں ڈال د
گلاب اس وقت خون میں لت پت بے خبر چارپائی پر پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر م
بھی بھر آیا اور میری آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی۔ میری یہ حالت دیکھ کر گرنا
بولا۔

''سردار! آپ فکر نہ کیجئے۔ یہ بھگوان نے کیا تو بچ جائے گی۔ آ
ایک لاجو کیا۔ سینکڑوں لاجو قربان کی جاسکتی ہیں'' یہ کہتے کہتے پھر اس کا گلا
گیا۔ تو یہ اس کی بہن تھی۔ گرنام سنگھ کی بہن لاجو جو اپنے بھائی کی طرح م
دار تھی اور میں ......؟ مجھے اپنے آپ سے شرم محسوس ہوئی۔ اس عرصے میں
قطعی بھول ہی چکا تھا۔ اب جو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ غائب تھی۔

لاجو کا زخمی جسم اب اس کی جھونپڑی تک پہنچ چکا تھا۔ چارپائی رکھ
چارپائی رکھتے ہی ایک بڑھیا گھبرا کر آگے بڑھی اور لاجو کو اس حالت میں
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور مجھ سے بولی۔

''اسے کیا ہوا سردار؟ کچھ تو بتایئے آپ کی لاجو کو کیا ہوا؟''۔ بڑھیا
طرح رقت کرنے سے میں نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لئے میں نے اب
لاجو کے چہرے اور جسم کو دیکھا اور ایک دبی دبی سی چیخ میرے منہ سے نکل گ
سنگھ مجھے بہلاوا دے رہا تھا۔ اس لئے کہ لاجو کا جسم تو گولیوں سے چھلنی

مر چکی تھی۔ میں نے سر جھکا کر گرنام سنگھ کی پیٹھ تھپکی اور کہا۔

''صبر کرو گرنام! صبر کرو'' اور یہ کہتے کہتے خود میرے آنسو نکل پڑے۔
لڑکی کی قربانی نے میرے دل پر بہت اثر کیا تھا میں سر جھکائے اس جھونپڑی
نکلا اور راستے بھر میری آنکھوں سے وہ گلاب چہرہ گھومتا رہا۔ خون میں لت پت
راتا ہوا چہرہ۔

میں سر جھکائے غمگین سا اپنے جھونپڑے میں داخل ہوا۔ میں راستے بھر
جس گلی سے گزرا اس میں کہرام پایا۔ کسی کا بھائی کسی کا بیٹا' کسی کا شوہر اس
لناک موت زیست کی لڑائی میں مارا جا چکا تھا۔ میرے کان ماؤں کی چیخوں۔
ں کے بین اور بوڑھے باپوں کی دردناک آہوں سے بھرے ہوئے تھے۔ بڑے
مجھے دیکھتے ہی بڑی ٹھکرائن سے بولے۔

''لو یہ آ گیا تمہارا جیالا بیٹا! جس نے تن تنہا اتنی بڑی پلٹن کو ٹھکانے لگوا
یری زندگی میں آج تک اتنا بڑا معرکہ نہیں ہوا تھا۔ تم ذرا باہر تو نکل کر دیکھو۔
وں کے انبار لگے ہوئے ہیں'' مجھے دیکھتے ہی بڑی ٹھکرائن آگے بڑھیں اور مجھے
ے لگا لیا اور بولیں۔

''مگر تو اتنا اداس ہے یہ کیا بات ہے؟ یہ تو خوشی کا موقع ہے'' میں نے
ات سے بھرپور آواز میں کہا ''ماں اگر تمہارے لئے کسی کا سہاگ لٹ جانا' کسی
ا بھائی چھن جانا' کسی ماں کا لال مارا جانا' کسی بوڑھے باپ کی آنکھوں کی
ی چھن جانا' خوشی کا موقع ہے تو ضرور خوشی مناؤ' ضرور'' یہ کہتے ہوئے میری

آواز بھرا گئی۔ ماں میرے یہ فقرے سن کر کچھ کھوسی گئی۔ مگر بڑے ٹھاکر گر۔
کم ہمتی کی بات کرتا ہے رنجیتے۔ لڑائی میں یہ تو ہوتا ہی ہے۔ تو نے خود ا
سے کتنی بیویوں کے سہاگ اجاڑ دیئے کتنی بہنوں کے بھائی چھین لئے۔ کتنی
کی گودیں ویران کر دیں۔ کتنے باپوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک آگ میں جھو
اور تو ہی نے کیا...... تیرے پرکھوں نے کیا کیا؟۔ یہ تو اس زندگی کی دین ہے
تو کیا میں کیا؟ سب کو ایک دن اسی طرح لڑتے ہوئے مارا جانا ہے۔ ا
بہادری ہے' اسی میں عزت ہے یہی ہماری زندگی کا مقصد ہے' پھانسی کا پھن
غارت گری' اگر ہم یہ سب چھوڑ بھی دیں اور یہ زندگی قطعی ترک بھی کر د
پھانسی کے پھندے سے ہم بچ سکتے ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں' اس لئے ہمیں بہاد
اپنے کام کو جاری رکھنا چاہئے اور غریبوں کا خون چوسنے والے سیٹھوں'
چھوٹے نوابوں اور راجوں کو اسی طرح موت کے گھاٹ اتار کر اپنا حق وص
چاہئے۔ یہی ہماری زندگی ہے''۔ بڑے ٹھاکر کی لمبی چوڑی تقریر نے ا
میرے دل پر کوئی اثر نہ کیا اور میں پردہ ہٹا کر جھونپڑے کے اندرونی حصے میں
ہو کر پیال دار نرم بستر پر گر پڑا۔ برابر ہی دوسرے بستر پر شوبھا منہ پھیلا
تھی۔ مگر نہ تو اس نے اور نہ ہی میں نے اس کی طرف کوئی توجہ کی۔ میں ا
اور ہی خیالوں میں غرق تھا میرے سامنے اس وقت بھی لاجو۔ کا خون میں
مسکراتا چہرہ تھا ایک جان نثار بھائی کی ایک جان نثار بہن لاجو۔ ایک بے و
کی باوفا محبوبہ لاجو محبت وقربانی کی ایک روشن مثال لاجو۔ سوچتے سوچتے

سے کئی دفعہ شاید لاجو نکل گیا۔ میں اس وقت چونکا جب میں نے اپنی گردن پر
کسی کی گرفت محسوس کی۔ میرے اوپر شوبھا سوار تھی' جو کہہ رہی تھی۔

''اب اگر تیرے منہ سے یہ نام نکلا تو تیرا گلا گھونٹ دونگی۔ سمجھا۔'' میں
نے آہستہ سے اس کی پتلی پتلی مگر گداز کلائیاں پکڑ لیں اور اپنی گردن سے الگ کر
یں۔

''شوبھا۔ ہوش میں آ۔ کیا ہو گیا ہے تجھے؟''

وہ بولی'' مجھے کچھ نہیں ہوا تجھے ہو گیا ہے۔ جب سے تو نے اسے زخمی دیکھا
ہے تو خود بھی کسی زخمی کی تڑپ رہا ہے۔ کیا ہو گیا ہے اگر ایک آدھ گولی لگ گئی' کون
سی مر جائے گی۔ اتنی حیادار کب ہے''۔

میں نے غصے سے کہا'' بکواس مت کر' مرنے والوں کو برا نہیں کہتے''۔

وہ ایک دم چونکی۔

''کیا وہ مر گئی' لاجو مر گئی؟۔ سچ'؟ اس کے لہجے میں عجیب خوشی اور
حیرت شامل تھی۔

''ہاں وہ مر گئی۔ تیری طرح نہیں تھی کہ خیالوں ہی میں بندوق چلاتی
تھی۔ میں نے اسے چڑانے کے لئے کہا وہ سچ مچ مر گئی اس وقت جھونپڑے کے
باہر والے حصے سے بڑے ٹھاکر کی آواز آئی۔

''رنجیتے باہر آؤ' گرنام آیا ہے۔ کہتا ہے لاجو کی ارتھی تیار ہے۔ تو نے
مجھے پہلے یہ کیوں نہیں بتایا؟''۔

ٹھاکر کی آواز سن کر میں باہر آیا‘ گرنام سنگھ سامنے سر جھکائے کھڑا تھا‘ اس وقت اس کا آدھا چہرہ بہت غم زدہ اور آدھا چہرہ بہت بھیانک لگ رہا تھا۔ وہ میری طرف منہ کئے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

’’تمام مرنے والوں کی ارتھیاں اس وقت شمشان میں پہنچ چکی ہیں جن میں ایک ارتھی لاجو کی بھی ہے‘ کیا آپ وہاں تک چلنا پسند کریں گے؟‘‘ میں نے اس کی آواز کے دکھ کو محسوس کیا اور ہم سب اس کے ساتھ گول وادی کے ایک حصے میں پہنچے جہاں تقریباً دو سو سے اوپر ارتھیاں رکھی ہوئی تھیں اور ان کے برابر ایک طرف سپاہیوں کی لاشوں کا ڈھیر تھا۔ جو بلاشبہ ان ارتھیوں سے دوگنا لگتا تھا میں نے آہستہ سے گرنام سے کہا۔

’’بقیہ لوگ زندہ پکڑ لئے گئے ہیں‘ ان کا کیا ہوا؟‘‘۔

’’وہ بڑے قید خانے میں آپ کے حکم کے منتظر ہیں‘ جب کہیں انہیں ٹھکانے لگا دیا جائے‘‘ میں نے گرنام سنگھ کا جواب سن کر کہا ’’نہیں ابھی نہیں‘ مجھے سوچنے دو۔‘‘ سب سے پہلے سپاہیوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگایا گیا۔ ایک عجیب سی بدبو سے تمام وادی بھر گئی انہوں نے ان لاشوں پر مٹی کا تیل چھڑک دیا تھا۔ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ پھر بقیہ تمام ارتھیوں کو بھی جلا دیا گیا۔ پوری وادی کے بچے بوڑھے اور جوان یہاں موجود تھے۔ ایک عجیب سی فضا تھی‘ جیسے آج آسمان سے اداسی برس رہی ہو۔ چاروں طرف مشعلیں روشن تھیں اور شعلوں کی زبانیں لاشوں کو چاٹ رہی تھیں۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ بڑے ٹھاکر میرے

کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مرگھٹ کی دیوار چڑھ گئے۔ وہ غالباً کچھ کہنا چاہتے تھے۔ تمام مجمع سمٹ کر ان کے اردگرد جمع ہو گیا۔ ان کی تقریر شروع ہوئی۔

’’اے اپنی عزت و غیرت پر جان قربان کرنے والو! سنو! کہ ہم سب ایک دوسرے کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ جن جوانوں نے بہادری سے لڑتے ہوئے اپنی جانیں اس وادی کے دوسرے رہنے والوں کے سکون و اطمینان کے لئے ان کی خوش حال زندگی کے لئے قربان کر دیں ہمارے دل‘ ان کی محبتوں‘ یادوں اور قربانیوں سے ہمیشہ ان کے احسان مند رہیں گے‘ وہ بہادر تھے‘ لڑتے ہوئے مارے گئے تمہارے لئے تم سب کے لئے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ان کے بیوی بچوں ان کے ضعیف باپوں کا سہارا بنیں‘ میں اعلان کرتا ہوں کہ اب سے ہم جو کچھ بھی لوٹ مار کر کے حاصل کریں اس میں ان مرنے والوں کے عزیزوں کا بھی اتنا حصہ ہوا کرے گا جتنا‘ انہیں ان کی زندگی میں ملتا۔ بلکہ آج سے یہ قانون جاری کیا جاتا ہے کہ جو بھی لڑتے ہوئے مارا گیا‘ اس کے عزیزوں کو ہمیشہ حصہ ملتا رہے گا‘‘ بڑے ٹھاکر کے یہ کہتے ہی ان کی ’’جے‘‘ سے تمام وادی گونج اٹھی وہ پھر بولے ’’تمہارے بہادر سردار نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر جس طرح اس ہار کو جیت میں بدلا ہے۔ یہ تو تم سب جان ہی چکے ہو گے‘‘ اس فقرے کے بعد سردار رنجیت سنگھ کی ’’جے‘‘ بولی جانے لگی اور مجمع کے اصرار پر مجھے بھی کچھ کہنے کے لئے منڈیر تک چڑھنا پڑا اگر میری آواز اتنی پاٹ دار نہیں جتنی بڑے ٹھاکر کی تھی۔ میں نے بولنا شروع کیا۔

''میرے بزرگو اور ساتھیو! میں نے اس لڑائی میں کوئی ایسا خاص کارنامہ انجام نہیں دیا۔ سوائے اس کے میں کسی طرح پچھلے خفیہ راستے سے آئی جی کی جیپ تک پہنچ گیا اور زبردستی رائفل کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ کر یہ اعلان کرادیا کہ تمام سپاہی ہتھیار ڈال کر ہاتھ اوپر اٹھالیں۔'' میں نے یہ جھوٹ دانستہ بولا تھا تاکہ وادی کے لوگ میری پراسرار قوتوں کے بارے میں نہ جان سکیں۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''بڑے ٹھاکر نے ابھی جو کچھ کہا میں بھی اس سے ہر طرح متفق ہوں۔ لیکن اس وقت سب سے پہلا مسئلہ جو ہمارے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ کسی طرح بھی اس راستے کو قطعی بند کردیں جو پولیس سے جھڑپ کے دوران بالکل تباہ ہو چکا ہے بلکہ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ دوبارہ اس راستے کو از سر نو تعمیر کیا جائے اور اس میں اس مرتبہ اتنی گنجائش رکھی جائے گی پولیس سے جو پندرہ ٹرک ملے ہیں وہ بھی اس راستے سے آجاسکیں تاکہ آئندہ ہم ان ٹرکوں سے بھی کام لے سکیں۔'' میری یہ بات سن کر مجمع میں کچھ شور سا ہوا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کرنے کی کوشش کی۔ غالباً وہ میری اس تجویز سے متفق نہیں تھے اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان میں سے کوئی بھی ان ٹرکوں کا استعمال نہیں جانتا تھا۔ میں نے ان کی اس بات کو بھانپ لیا اور کہنا شروع کیا!

''میں سمجھتا ہوں کہ تم میں سے کوئی بھی ان کا استعمال نہیں جانتا مگر یہ کچھ ایسی مشکل بات نہیں۔ ہم قیدیوں کو اس پر مجبور کریں گے کہ وہ ہمیں ان کا استعمال بتائیں ہمیں ابھی یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ پولیس یہاں کس طرح پہنچ گئی۔ یہ بھی

قیدیوں سے معلوم ہوسکتا ہے' فی الحال کل سے راستے کی تعمیر شروع ہو جانی چاہئے اور اس کی نگرانی گرنام سنگھ کرے گا جو اس فن سے اچھی طرح واقف بھی ہے'' یہ کہہ کر میں مرگھٹ کی دیوار سے اتر آیا اور ہم سب لوگ اپنے اپنے جھونپڑوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ گرنام سنگھ میرے ساتھ تھا میں نے چلتے چلتے اس سے کہا ''تم قید خانے سے آئی جی کو نکال کر میرے جھونپڑے پہنچو''۔

گرنام سنگھ خاموشی سے اثبات میں سر ہلا کر چلا گیا اور میں بڑے ٹھاکر' بڑی ٹھکرائن اور شوبھا اپنے گھوڑوں پر جھونپڑے کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں مجھے ایک خیال آیا اور میں نے اپنا گھوڑا شوبھا کے گھوڑے کے قریب لاتے ہوئے اس سے کہا۔

''شوبھا۔ بڑے ٹھاکر اور ٹھکرائن کو چلنے دو' ہم ابھی چلتے ہیں' ذرا قید خانے ہی کی سیر ہو جائے...... کیا خیال ہے تمہارا؟''۔

وہ تو شاید خدا سے یہی چاہتی تھی کہ اسے اور مجھے تنہائی کا موقع ملے۔ وہ فوراً راضی ہوگئی۔ میں اسے قید خانے تک کبھی نہ لے جاتا مگر میں اس کے راستے ہی سے ناواقف تھا۔ مگر اب تک حالات نے خود بہ خود میری مدد کی تھی اور کچھ میں نے اپنی ذہانت سے کام لیا تھا جو یہ راز اب تک نہیں کھلا تھا کہ میں مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ نہیں علی حسن ہوں جس نے زبردستی رنجیت کے جسم پر قبضہ کرلیا ہے' سب مجھے رنجیت سنگھ ہی سمجھے ہوئے تھے میں اپنے خیالات سے باہر نکلا اور بڑے ٹھاکر سے قریب ہو کر کہا۔ ''بابا۔ میں اور شوبھا ابھی قید خانے ہو کر آتے ہیں' آپ

چلیئے۔''

بڑے ٹھاکر نے سر ہلا دیا اور ہم دونوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں
دیں۔ آج پھر میری وہی حالت تھی جو اس سے پہلے دو موقعوں پر مجھ پر گزر چکی تھی
ایک تو تھانہ، گڑوال کے راستے میں' جس سے میں ناواقف تھا اور اپنی ناواقفیت
طرح ظاہر نہیں ہونے دی۔ دوسرے آج ہی جب گول وادی کے پچھلے خفیہ را
تک میں گرنام سنگھ کے ساتھ پہنچا تھا۔ مگر اس وقت بھی کیونکہ حالات ہنگامی
اس لئے میں نے گرنام سنگھ کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ میں راستہ نہیں جا
اب میں شوبھا کو صرف اس غرض سے ہمراہ رکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ میری رہبری
خانے تک کر سکے اور یہ بات میں اس سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا اس لئے دانستہ ج
کسی گلی کا موڑ آتا میں اس سے اپنا گھوڑا پیچھے کر لیتا۔

میں نے اچانک اپنا پروگرام بدل دیا تھا۔ پہلے میرا یہ خیال تھا کہ میں
جی کو اپنے جھونپڑے پر ہی بلا کر اس کے ذہن کو قابو میں کر کے اس سے پوچھوں گا
کس طرح یہاں تک پہنچا؟ مگر اس میں ایک خطرہ تھا اگر میں جھونپڑے میں یہ س
کرتا تو میری پراسرار قوتوں کا راز بڑے ٹھاکر وغیرہ کو بھی معلوم ہو جاتا۔ یہ با
میرے ذہن میں بعد میں آئی جب میں گرنام سنگھ کو قید خانے روانہ کر چکا تھا اور
چاہتا تھا کہ جلد سے جلد وہاں تک پہنچ جاؤں۔ ہم دونوں جلدی اس جگہ تک پہنچ
جس کو قید خانہ کہا جاتا تھا' مگر یہ تو ایک میدان تھا جس کے سامنے پہاڑی کی دی
سے راستہ ختم کر دیا تھا سپاٹ سی دیوار میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ ایک گڑگڑاہ

ی میں نے سنی اور اب جو سامنے پہاڑی کی سپاٹ دیوار کو دیکھا' تو وہاں بڑا سا خلا
نظر آیا جس سے گرنام سنگھ ایک گھوڑے پر سوار نکل رہا تھا' اس کے ہاتھ میں مشعل
تھی۔ میں نے غور سے دیکھا تو اس کے ساتھ ہی ایک گھوڑا اور نظر پڑا۔ اس پر کوئی
شخص بندھا ہوا تھا' ہمیں دیکھ کر گرنام سنگھ رک گیا اور گھوڑے سے اتر کر مجھے سوالیہ
نظروں سے دیکھ کر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے کہا۔

''گرنام ' ہم خود یہیں آ گئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تنہائی میں اس سے کچھ
پوچھیں اور اس کے لئے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں''۔

گرنام سنگھ نے یہ سن کر کہا'' میری خود یہی منشا تھی سردار، مگر میں نے آپ
کی بات نہیں کاٹی۔ اس لئے کہ یہاں قید خانے میں اذیت دینے اور قبولوانے
کے تمام ذرائع موجود ہیں نسبت جھونپڑے کے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر اس طرف بڑھا
کچھ دیر پہلے خلاء نمودار ہوئی تھی۔ اس لئے کہ گرنام کے باہر آتے ہی خلاء پھر برابر
ہو گئی تھی۔ گرنام سنگھ گھوڑے پر سوار ہوا اور سپاٹ دیوار پر ابھرے ہوئے ایک پتھر
پر زور آزمائی کرنے لگا۔ پھر ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی اور ہم اس چوڑی سی خلاء
میں داخل ہو گئے۔ تھوڑی دور چل کر ایک سلاخوں والا پھاٹک سا تھا جس کے باہر
ایک شخص بندوق لئے ٹہل رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر ذرا سا جھکا اور دروازے کا بڑا تالا
کھول دیا۔ اس پھاٹک سے گزرتے ہی سیدھے ہاتھ پر ایک بہت بڑا ہال سا نظر
پڑا جس میں آٹھ دس جوان گھوڑوں کی مالش کر رہے تھے۔ یہ اصطبل تھا جس میں
تقریباً 50 یا 60 بہترین نسل کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے، ان میں سے دو تین

نوجوان آگے بڑھے اور انہوں نے سر جھکا کر پہلے مجھے تعظیم دی اس کے بعد
سب کے گھوڑوں کی باگیں تھام کر اصطبل میں چلے گئے اب میں شوبھا اور گر
سنگھ ایک راہداری طے کر رہے تھے۔ میں ابھی چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ اپنے با
طرف ایک اور بڑا سا ہال دیکھا۔ یہ ہال اس وقت مقفل تھا مگر اس کے سلاخوں
دروازے سے اندر دیکھا جا سکتا تھا۔ اس میں لاتعداد بندوقیں رائفلیں اور د
اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنا اسلحہ نہیں دیکھا تھا۔ گرنام
نے اس طرف میری توجہ پا کر کہا۔

''سردار۔ یہ جو رائفلوں کا نیا ڈھیر دیکھ رہے ہیں' یہ آج ہی ان سپاہ
سے حاصل کی گئی ہیں، اور دوسری طرف جو ڈھیر ہے وہ گولوں کا ہے۔ کل
رائفلوں کو صاف کر کے اور تیل لگا کر حفاظت سے رکھ دیا جائے گا''۔

میں نے سر ہلایا اور آگے بڑھا۔ میں اس بات پر حیران تھا کہ اس جگہ
گھٹن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے اسی لئے ایک نظر راہداری کی چھت پر ڈ
' جہاں مجھے کچھ فاصلے سے بڑے بڑے سوراخ نظر پڑے جو تاریک سے تھے
راہداری میں کیونکہ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مشعلیں روشن تھیں اس لئے پو
طرح روشن تھی۔ کچھ دور چل کر راہداری ختم ہو گئی...... سامنے ایک سپاٹ دیوار
گرنام سنگھ پھر آگے بڑھا اور سامنے دیوار پر لگی ہوئی ایک مشعل کو دیوار سے الگ
' اور اس جگہ اپنا ہاتھ ڈال کر غالباً کوئی کل دبائی اور کل دباتے ہی بولا۔

''سردار! سنبھل کر کھڑے ہو جایئے ہم نیچے قید خانے میں چل ر

ہیں'' یہ کہہ کر اس نے دوبارہ مشعل میں اس سوراخ میں لگائی ہی تھی کہ مجھے ایسا لگا
جیسے زمین نیچے دھنسنے لگی ہو۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنے
ہونٹ سختی سے بھینچ لئے ورنہ بے اختیار چیخ نکل جاتی۔ میں شوبھا اور گرنام سنگھ نیچے
دھنستے جا رہے تھے اور ہمارے اوپر ایک خلا سا تھا جیسے ہم کسی گہرے کنویں میں اتر
رہے ہوں......۔

شوبھا کے لئے غالباً یہ سب کچھ متوقع تھا اس لئے اس کے چہرے سے
کوئی حیرت یا خوف ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے زمین رک گئی ہو۔ ہمارے
دائیں طرف ایک دروازہ تھا سلاخوں دار دروازہ جس کے باہر ایک شخص پہرا دے
رہا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی اس دروازے کا تالا کھول دیا اور ہمیں جھک کر تعظیم
دی دروازے سے جیسے ہی ہم نے چوڑی سی راہداری میں قدم رکھا ایک بڑی سی
سل چھت سے آہستہ آہستہ پھسل کر زمین میں پیوست ہو گئی، اس سے پہلے وہ شخص
دروازے کا تالا لگانا نہیں بھولا تھا۔ اب وہاں ایک سپاٹ دیوار تھی یہ بھی ایک
چوڑی سی راہداری تھی جس کے دونوں طرف مشعلیں روشن تھیں اور دور تک دونوں
طرف بڑے بڑے دروازے نظر آ رہے تھے جن میں تالے پڑے ہوئے تھے وہی
شخص جس نے ہمارے لئے تالا کھولا تھا آگے بڑھا اور بائیں ہاتھ پر بنے ہوئے
ایک کمرے کا تالا کھولا دو یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس میں ایک طرف ایک چبوترہ
تھا۔ جس پر جنگلی جانوروں کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے اور
دوسری طرف ایک پیال کا نرم بستر زمین پر بچھا ہوا تھا اس پر جنگلی جانوروں کی نرم

کھالیں تھیں۔ ہم اس میں داخل ہوئے۔

گرنام نے کہا۔ ''آپ چاہیں سردار تو یہیں بیٹھیں۔ میں آئی جی کو او پ
سے لے کر آتا ہوں۔ اس لئے کہ میں تو یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ تو ایک گھوڑے کی
پیٹھ پر بندھا ہوا تھا اور میرے ساتھ ساتھ ہی تھا میں اس کے لئے معافی چاہتا
ہوں''۔ وہ یہ کہہ کر الٹے پاؤں واپس پھرا اور اوپر جانے کے لئے روانہ ہوگیا۔ میں
نے شوبھا سے کہا۔

''آؤ اس وقت تک ذرا قیدیوں کو دیکھ لیا جائے''

ہم دونوں اس کمرے سے نکلے اور آگے راہداری میں دور تک چلے گئے۔
دونوں طرف سلاخوں دار دروازے تھے' یہ دروازے بڑے بڑے ہالوں کے تھے۔
ہر ہال میں مجھے تقریباً سو ڈیڑھ سو سپاہی نظر پڑے یہ کل چھ ہال تھے جن میں سے
اس وقت چار تقریباً پورے بھرے ہوئے تھے' ایک میں صرف پچاس ساٹھ سپاہی
تھے اور بقیہ ایک خالی پڑا تھا۔ مگر شاید یہ دوسرے ہالوں سے مختلف تھا اس لئے کہ
اس میں طرح طرح سے اذیت دینے کا سامان تھا، چھت سے زنجیریں لٹکی ہوئی
تھیں۔ جن کے سروں پر ہتھکڑیاں سی تھیں اور جگہ جگہ فرش پر بھی ایسی ہی بھاری
بھاری زنجیریں پڑی ہوئی تھیں ایک بڑے سے ڈبے میں چمڑے کے کوڑے بھیگ
رہے تھے اور نہ کیا کیا الا بلا اس ہال نما بڑے کمرے میں جو دوسرے ہالوں سے ذرا
چھوٹا اور مختلف تھا' برا پڑا تھا' یہاں سے راہداری ختم ہوگئی تھی۔ میری اپنی دانست
میں ورنہ کیا خبر اس سے آگے بھی کچھ اور موجود ہو۔ ہم دونوں کو دیکھ کر ان قیدیوں

ے طرح طرح کی گالیاں دیں مگر میں خاموشی سے انہیں دیکھتا ہوا شوبھا کے ساتھ
پس پہلے کمرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس بات سے غالباً قیدی حیران ہوئے کہ
ں نے جواب میں ان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ شوبھا کو دیکھ کر بھی طرح طرح کی نازیبا
کات کر رہے تھے۔ مگر میں نے شوبھا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے غصے میں
نے سے باز رکھا مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ جو سپاہی زخمی تھے ان کی باقاعدہ
رہم پٹی کر دی گئی تھی۔

ہم دونوں ابھی کمرے میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ گرنام سنگھ اس سبز آنکھوں
لے آئی جی کو لے کر آگیا' اس کے ہاتھ اس وقت پشت پر بندھے ہوئے تھے۔
ہ بستر پر بیٹھا ہوا تھا اسے دیکھ کر کھڑا ہوگیا اور اس کے قریب پہنچا تھا کہ اس نے
ور سے میرے منہ پر تھوک دیا اور ایک موٹی سی گالی دی یہ دیکھتے ہی گرنام سنگھ جو
اس کے برابر کھڑا تھا برہم ہوگیا اور اس نے اپنی بندوق کا ایک کندا بہت زور سے
اس کے کاندھے پر مارا' وہ تڑپ کر میرے قدموں پر گر گیا دوسری ٹھوکر بھی خاصی
اندار تھی جو اس کے سر پر پڑی تھی یہ بھی گرنام سنگھ ہی کا کارنامہ تھا۔ میں نے اپنے
ہرے سے تھوک پونچھتے ہوئے گرنام سنگھ کو روکا۔

''بس گرنام سنگھ بس۔ یہ مر جائے گا۔ اور میں یہ نہیں چاہتا'' آئی جی
ڑکھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا جو اس کے خوبصورت
ہرے پر بہت برا لگ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ماتھے سے خون پونچھ
یا۔ اس نے غصیلی نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا۔

"رنجیت سنگھ! میں نے عہد کیا تھا کہ یا تو تمہیں گرفتار کروں گا یا......"
نے اپنا ماتھا جھٹکتے ہوئے کہا۔

"نہ معلوم مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں نے خود اپنے سپاہیوں کو ہتھیار ڈا
حکم دے دیا' میں نہیں کہہ سکتا کہ خدا جانے وہ کون سی پراسرار قوت تھی جس نے
اس پر مجبور کر دیا۔ یہ کہہ کر وہ دانتوں سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگا' اس کے یہ کہ
گرنام سنگھ کچھ حیرت زدہ سا ہوا۔ شوبھا خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی
غالباً اس کے بیان پر شک کر رہی تھی میرے سوا شاید کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسے
نے اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے سپاہیوں کو ہتھیار ڈال کر ہاتھ اوپر اٹھا
کا حکم دے۔ میں نے گرنام سنگھ کی طرف مڑ کر کہا۔

"انہیں آخری ہال میں لے کر چلو اور سنو ان کے ہاتھ بھی کھ
دو" گرنام ہچکچایا۔ مگر سردار...... ۔ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا" کچھ نہیں
میں جو کہتا ہوں وہ کرو' میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے"۔

میرے کہنے پر گرنام سنگھ نے آئی جی کے ہاتھ یہیں کھول دیئے اور ہا
کھولتے ہی اپنی بندوق کی نال اس کی پشت پر رکھ کر دھکا دیا۔

"چلو" میں نے گرنام سنگھ کے اس رویے پر اس سے کچھ نہیں کہا' حالا
مجھے ناگوار ضرور ہوا تھا۔ وہ شاید آئی جی کے ساطرح منہ پر تھوکنے کو غالباً ابھی نہ
بھولا تھا۔ میں نے شوبھا سے کہا" تم یہیں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں...... اور
گرنام بھی تمہارے پاس آ جائے گا" وہ شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ میں آئی جی کو اذ

دے کر کچھ قبولوانا چاہتا ہوں اس لئے وہ وہیں بستر پر نیم دراز ہو گئی۔ ہم جیسے ہی
راہداری میں داخل ہوئے ہمیں دیکھتے ہی پھر قیدی سپاہی جنگلے پکڑ پکڑ کر کھڑے ہو
گئے اور پہلے کی طرح گالیاں بکنے لگے۔ اس پر گرنام سنگھ ان کی طرف پلٹا۔

"چپ رہو۔ حرام زادو۔ ورنہ ایک ایک کو گولی مار دوں گا گرنام سنگھ کا
بھیانک چہرہ دیکھ کر وہ غالباً سہم گئے شاید وہ مجھ سے پہلے ان میں سے کچھ کی خاطر
مدارت کر چکا تھا، اس پر اس کا دو حصوں میں بٹا ہوا بھیانک چہرہ وہ یقیناً بہت
سفاک آدمی تھا، اس نے جس طرح آئی جی کے کاندھے پر بندوق کا کندہ میرے
سامنے مارا تھا، وہ اس کی درندگی کا ایک نمونہ تھا۔ آئی جی اب بھی ایک کندھا ڈالے
ہوئے راستہ طے کر رہا تھا' اس کے کندھے میں غالباً سخت تکلیف تھی اس کے ماتھے
پر اوندھے منہ گرنے کے سبب گومڑ پڑ گیا تھا۔ گرنام سنگھ نے مجھے اس ہال نما کمرے
کی چابی اپنی جیب سے نکال کر دی' میں نے آگے بڑھ کر کمرہ کھولا۔ آئی جی جیسے ہی
اس کمرے میں داخل ہوا جس میں جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں وہ کچھ ٹھٹک گیا۔ غالباً
وہ سمجھ گیا کہ مجھے یہاں یہ لوگ اذیت دینے لائے ہیں۔ اذیت دینے کا طرح طرح
کا سامان یہاں موجود تھا اور بھاری زنجیریں فرش اور چھت پر لٹکی دیکھ کر وہ سب
کچھ سمجھ گیا۔ وہ کمرے میں ذرا سہما سہما سا داخل ہوا۔

میں نے گرنام سنگھ سے کہا۔" اب تم جاؤ اور شوبھا کے پاس ٹھہرو میں آتا
ہوں۔" گرنام سنگھ بھی غالباً یہی سمجھا تھا کہ میں آئی جی کو اذیتیں دوں گا' اس لئے وہ
بولا۔

''سردار' میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا' شاید جلد کچھ نہ قبولے' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''گرنام۔ میں تمہارا سردار ہوں۔ کیا مجھے کچھ اور بھی کہنے کی ضرورت ہے؟''۔ وہ میرے خشک لہجے کو سمجھ گیا اور چپ چاپ دروازہ بھیڑ کر چلا گیا۔

رحمٰن مجھ سے مخاطب ہوا۔

''اگر تمہیں برا نہ لگے تو کیا میں سگریٹ پی سکتا ہوں۔ میں نے شام سے سگریٹ نہیں پی۔''

میں نے کہا۔ ''ضرور پیو۔''

اس نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگا کر مجھے بھی پیش کی۔ میں نے شکریہ کہہ کر انکار کر دیا۔ ''تم سکون سے سگریٹ پی لو' ہم پھر باتیں شروع کریں گے۔''

اس نے کہا۔ ''نہیں! تمہیں جو کچھ کہنا ہے کہو۔ مجھے اپنے پچھلے رویے پر افسوس ہے کہ میں نے تمہارے منہ پر تھوکا۔''

میں نے کہا۔ ''خیر کوئی بات نہیں، اس وقت میں تمہارا دشمن تھا مگر......

اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''دشمن تو اب بھی ہو......''

میں نے بات کو زیادہ نہ بڑھا کر اپنا کام شروع کیا ہی تھا کہ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''تم رنجیت سنگھ! پولیس کی دسترس سے محفوظ نہیں

رہ سکتے۔ اگر تم نے آج ایک رحمان کو شکست دے دی ہے تو کل کک......'' یہ کہتے کہتے وہ ہکلانے لگا، میں اس کے ذہن پر قبضہ جما چکا تھا۔ ہکلاتے ہکلاتے اسے اور مجھے دونوں کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میرے ذہن نے اس کے ذہن کو حکم دینا شروع کیا۔

''تم رحمان...... رنجیت سنگھ کے وفادار ہو...... اس کے ساتھی ہو۔''

اس کا جواب تھا...... ''نہیں۔''

''قطعی تم مشہور ڈاکو سردار رنجیت سنگھ ہی کے ساتھی ہو۔ ہاں کہو!''

اس کے ذہن نے پھر آخری مدافعت کی ''نہ...... نہ...... وہ۔''

''ہاں...... ہاں کہو۔ ہاں میں مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ کا وفادار ساتھی ہوں۔''

''تم رنجیت سنگھ سے بے انتہا محبت کرتے ہو، اس کے لئے اپنی جان تک دے سکتے ہو...... تم اس کے غلام ہو۔''

میرے ذہن نے ایک اور قدم آگے بڑھ کر حکم دیا۔ ابھی غالباً اس کے ذہن میں مدافعت کی قوت باقی نہ تھی۔ میرا سر دکھنے لگا۔ مگر میں نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں سے نہیں ہٹائیں۔ اس کا ذہن کہہ رہا تھا۔ ''نہیں...... میں آئی جی پولیس ہوں۔''

میں نے غصے سے اس کے ذہن کو کئی بار جھٹکا۔ جس سے پہلے ہی کی طرح اس کے منہ سے کراہیں نکل گئیں۔ اس کے ہاتھ میں غالباً سگریٹ اب بھی

سلگ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے بغیر آنکھیں ہٹائے اس کے ہاتھ سے
سگریٹ لے کر دور پھینک دیا۔ اس کی سبز آنکھیں پھٹی ہوئی سی تھیں۔ میرے ذہن
نے پھر اس کے ذہن کو حکم دینا شروع کیا۔ میرے ذہن کا تناؤ پہلے سے کچھ کم ہو گیا
تھا۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اب اس کا ذہن پہلی سی مدافعت کا اہل نہیں ر
ہے۔

''تم رحمان اپنی پچھلی زندگی قطعی بھول جاؤ گے۔''

جیسے اس کے خوابیدہ ذہن نے جواب دیا۔

''قطعی بھول جاؤں گا۔''

اب وہ پوری طرح میرے قابو میں تھا۔

''تم اپنی پچھلی زندگی بالکل بھول چکے ہو، مگر تمہاری ذہانت و صلاحیت
اپنی جگہ پر برقرار ہے۔ تم اپنی تعلیم بھی نہیں بھولے۔ اس کے علاوہ سب کچھ بھول
چکے ہو۔ صرف اتنا جانتے ہو کہ تم رنجیت سنگھ کے وفادار ساتھی ہو اور وہ تمہارا سردا
ہے، اس کے ہر حکم کے آگے تم اپنا سر جھکا دو گے۔ تم اس کے لئے اپنی جان بھی
دے سکتے ہو۔ بولو؟ کیا تمہیں اپنے سردار رنجیت سنگھ سے اتنی ہی محبت ہے۔''

اس کے ذہن کا جواب تھا۔'' ہاں میں اپنے سردار رنجیت سنگھ کے ہر حکم
مانوں گا۔ میں اس کا غلام ہوں۔''

میں نے لقمہ دیا۔'' اور سردار کے ساتھیوں سے بھی تم بھائیوں جیسی محبت
کرو گے۔''

''بھائیوں'' کے لفظ پر اس کے ذہن نے پھر قلابازی سی کھائی۔'' بھائی
ئی ...... '' وہ رکا '' میرا بھائی کون ہے؟ کہاں ہے؟ مگر اس کا ذہن جواب
ینے سے قاصر تھا۔ وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ غالباً وہ اپنے کسی بھائی سے شدید
ت کرتا تھا۔ وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ غالباً وہ اپنے کسی بھائی سے شدید محبت کرتا
۔ جبھی اس لفظ نے اس کے ذہن پر اثر کیا۔

میں نے پھر کہا۔'' نہ تمہارے کوئی ماں ہے نہ بھائی نہ بہن اور نہ کوئی۔ تم
ا ہو بس تم اتنا جانتے ہو کہ تمہیں سردار رنجیت سنگھ سے ہر چیز سے زیادہ محبت ہے تم
ں کے وفادار اور غلام ہو۔''

اس کے ذہن کا جواب تھا۔'' ہاں اور میں کچھ نہیں جانتا۔ میرا بھائی۔
ئی اور سب کچھ سردار رنجیت سنگھ ہے...... میں اسی کا ہوں...... میں اور کچھ نہیں
نتا کچھ بھی نہیں۔''

میرے ذہن نے آخری حکم دیا۔'' تم یہاں سے کہیں نہیں بھاگو گے۔
ارا سب کچھ تمہارا سردار اور تمہارے ساتھی ہیں۔ تم ہوش میں آنے کے بعد یہ بھی
ل جاؤ گے کہ تمہیں کسی نے اس بات پر مجبور کیا تھا۔''

یہ کہہ کر میں نے آنکھیں ہٹالیں میری آنکھوں کے ڈھیلے درد کرنے لگے
ے۔ یقیناً وہ ایک بہت طاقت ور ذہن کا مالک تھا۔ اس نے میری آنکھیں ہٹتے ہی
ے جھٹکا سا لیا اور بستر پر نیم بے ہوشی کے عالم میں لیٹ گیا وہ کئی راتوں کا جاگا
معلوم ہوتا تھا۔ اس کی گہری سبز آنکھیں ایک دم سرخ ہو گئیں تھیں۔ وہ نڈھال ہو

کر بستر پر گر پڑا۔ میں نے جھک کر اس سے کہا۔

''کیسے ہو رحمٰن! تمہارا کیا حال ہے؟''

اس نے نحیف آواز میں جواب دیتے ہوئے تعظیماً اٹھنا چاہا۔ ''ٹھیک ہوں سردار' کچھ کمزوری سی محسوس ہو رہی ہے۔''

میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے لٹاتے ہوئے کہا۔

''کچھ دیر لیٹو...... ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

وہ بولا۔ ''مگر مجھے کیا ہو گیا تھا سردار؟ میں کہاں ہوں؟''

''تم ٹھیک ہو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوا تھا۔ تم ہمارے پاس ہو۔ تم لیٹو! میں تمہارے لئے دودھ کا انتظام کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں راہداری میں آیا اور زور سے گرنام سنگھ کو آواز دی۔ میری آواز راہداری میں گونج گئی۔ میری آواز سن کر وہ گھبرایا ہوا دوڑ کر آیا۔ ''کیا ہے سردار؟'' قریب آ کر وہ بولا۔

میں نے کہا ''کوئی خاص بات نہیں ایک پیالہ گرم دودھ چاہئے۔''

میرے یہ کہنے پر پہلے کچھ حیران ہوا اور پھر سامنے سپاٹ دیوار دیوار پر لگی مشعل اس کے سوراغ سے نکال کر کوئی کل دبائی۔ دیوار ایک طرف کھسک گئی۔ اندیشہ صحیح ثابت ہوا کہ دیوار کے ادھر بھی کچھ ہے۔ یہ ایک بڑا سا باورچی خانہ جس میں بہت سے لوگ کھانا پکانے میں مشغول تھے۔ میں پھر ہال نما کمرے میں داخل ہوا اور دیکھا کہ مجھے دیکھ کر رحمٰن اٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔

میں نے کہا ''لیٹے رہو...... ابھی اور لیٹے رہو' دودھ ابھی آتا ہے۔''

دیر بعد ہی گرنام سنگھ دودھ لے کر آ گیا۔ میں نے آئی جی رحمان کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھایا اور خود اس کے پاس بیٹھ کر اپنے ایک ہاتھ سے دودھ کا رااس کے منہ سے لگا دیا۔ گرنام سنگھ پاس کھڑا یہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہا غالباً وہ اس توقع میں تھا کہ آئی جی زنجیروں میں بندھا ہوگا۔ اور اس کے جسم پر وں کی مار کے نشان ہوں گے اور وہ کراہ رہا ہوگا' مگر یہاں ماجرا ہی اور تھا اس خیال کے خلاف آئی جی اطمینان سے بستر پر کپڑے پہنے لیٹا تھا۔ وہ اپنی ایک ت زدہ آنکھوں سے کبھی اس کے بے داغ جسم کو دیکھتا اور کبھی مجھے۔

اب شاید تم اٹھ سکتے ہو رحمان! اور اپنی سگریٹ تو سلگا لو' تم سگریٹ بھی تو ہو۔''

''ہاں!'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لی' وہ بڑے ام سے سر جھکائے میرے پاس کھڑا تھا جیسے میرے حکم کا منتظر ہو۔

میں نے کہا۔ ''ان سے ملو رحمان۔ یہ تمہارے ساتھی گرنام سنگھ ہیں۔'' نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ گرنام سنگھ نے بھی میرے اشارے پر ہاتھ آگے ادیا۔ میں نے دیکھا کہ رحمان کی گرفت دوستانہ تھی۔ مگر گرنام سنگھ کی غیر دوستانہ نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے گرنام سے کہا۔ ''گرنام آج سے یہ رے ساتھی ہیں' سمجھے تم ان پر ہر طرح اعتبار کر سکتے ہو چلو۔ میرے اس طرح پر گرنام سنگھ نے ایک دفعہ میری طرف حیرت سے دیکھا اور ساتھ ساتھ چلنے رحمان بھی اب سر جھکائے میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ گرنام سنگھ حیرت زدہ

تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ میں نے اتنی جلدی آئی جی کی بات کا اعتبار کس طرح کرلیا۔ ہم لوگ راہداری سے گزرتے ہوئے اس پہلے کمرے میں آئے جس میں شوبھا کو چھوڑ گئے تھے۔ وہ خاصی اکتائی اکتائی لگ رہی تھی میں نے کمرے میں پہنچتے ہی کہا۔ ''یہ تمہارے سردار کی بہن شوبھا ہے......شوبھا انہیں نمستے کرو۔''

شوبھا میری بات سن کر اور جل گئی اور بولی۔ 'میں تو نہیں کرتی اسے نمستے اور نہ ہی تو میرا بھائی ہے۔'' یہ سن کر گرنام سنگھ ایک دفعہ چونکا۔ میں نے بات ٹالنے کے لئے فوراً کہا۔ ''اچھا ایک دم اتنی ناراض ہوگئی کہ ہر رشتہ ختم کرلیا۔''

وہ پھر بولی۔ ''ہر رشتہ کیوں......تو تو میرا......'' میں نے آگے بڑھ کر جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ کہیں یہ گرنام کے سامنے ایسی ویسی کوئی بات نہ کہہ دے۔

شوبھا کے ذہن کو جب سے میں نے اپنے قابو میں کیا تھا وہ مستقل میرے لئے خطرہ بن گئی تھی' اس لئے کہ وہ کہیں بھی اس بات کا اعتراف کرسکتی تھی کہ میں اس کا بھائی نہیں عاشق ہوں۔ جب کہ تمام وادی والے اسے میری بہن سمجھتے تھے۔

جب میں آئی جی رحمان کو لے کر اس قید خانے سے نکل رہا تھا۔ گرنام سنگھ نے ایک دفعہ پھر مجھے ذرا سا الگ لے جا کر کہا۔

''سردار کیا یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے کہ آپ نے اسے آزاد کردیا۔''

میں نے کہا۔ ''گرنام یہ آزاد نہیں ہے' اب ہمیشہ کے لئے ہمارا غلام ہو چکا ہے۔ وقت آنے پر تم خود دیکھ لوگے۔''

وہ بولا۔ ''اور بڑے ٹھاکر''

''میں اسے لے کر وہیں تو جا رہا ہوں...... یہ آج سے میرے ساتھ ہی رہے گا۔''

رات گول وادی پر دھیرے دھیرے برس رہی تھی اور نہ جانے اپنا کتنا سفر طے کر چکی تھی گلیوں میں دور تک دورویہ مشعلوں کی قطاریں ایک عجیب سماں پیدا کر رہی تھیں تمام ماحول ساری فضائیں یوں لگ رہی تھی جیسے کہیں دور سے کوئی جادوگر آیا ہو اور ساری وادی کو پتھر کا بنا گیا ہو۔ ایسا سناٹا تو کسی طوفان سے پیشتر ہوتا ہے یا طوفان گزر جانے کے بعد۔ عجیب بات یہ تھی کہ ہمارے گھوڑوں کے دوڑنے سے جو آواز پیدا ہو رہی تھی' وہ بھی اس سناٹے کا حصہ محسوس ہو رہی تھی۔ میرے گرنام سنگھ کے اور آئی جی رحمان کے گھوڑے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے میرے ہی گھوڑے پر شوبھا بھی میرے ساتھ بیٹھی تھی۔

گرنام سنگھ کا جھونپڑا قریب آ گیا اور وہ رک گیا۔ میں شوبھا اور رحمان آگے بڑھ گئے۔ بڑے ٹھاکر ابھی نہیں سوئے تھے اور بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے ہم جب اپنے جھونپڑے میں داخل ہوئے تو انہوں نے رحمان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے رحمان سے کہا۔ ''رحمان ان سے ملو' یہ بڑے ٹھاکر ہیں۔ تمہارے سردار کے بابا۔'' میں نے بابا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اور بابا! یہ رحمان ہے۔ ہمارا نیا ساتھی۔ یہ آج سے میرے ساتھ ہی اس جھونپڑے میں رہے گا۔''

بڑے ٹھاکرے نے ذرا ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ''رنجیتے! اجنبیوں پر اعتبار کرنے کا انجام ایک مرتبہ تم اور ہم سب بھگت چکے ہیں۔ کرتار کا واقعہ ابھی کوئی زیادہ پرانا نہیں میں اب تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم اپنے ساتھ باقی تمام وادی والوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈالو''

میں ان کے شک پر دل ہی دل میں ہنسا اور سوچنے لگا کہ اگر خدانخواستہ اس وقت انہیں یہ بتا دیا جائے کہ یہ پولیس کا آئی جی ہے جس نے آج ہم پر پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ حملہ کیا تھا تو سرے سے اکھڑ ہی جائیں گے میں نے ان کی بات کا زیادہ نوٹس نہ لیتے ہوئے پراعتماد لہجے میں کہا۔

''بابا اس مرتبہ ایسا نہیں ہوگا۔ ہم ہر مرتبہ دھوکا نہیں کھا سکتے۔ اور پھر یہ کہہ کر مجھے رحمان کی وفاداری پر پورا یقین ہے۔''

بڑے ٹھاکر نے طنزیہ لہجے میں وفاداری کے لفظ کو دہرایا اور کہا۔ ''اتنی جلدی تمہیں اس کی وفاداری کا یقین بھی آگیا؟''

''قطعی، مجھے اس پر اتنا ہی بھروسہ ہے، جتنا اپنے آپ پر یا کسی وفادار و جان نثار ساتھی پر ہو سکتا ہے اور وقت آنے پر آپ کو اس بات کا اندازہ ہو جائے گا۔

غالباً ابھی تک بڑے ٹھاکر نے رحمان کا پوری طرح جائزہ نہیں لیا تھا۔ ورنہ وہ اس وقت بھی آئی جی کی وردی ہی میں تھا۔ اس عرصے میں شوبھا جھونپڑے کے اندر والے حصے میں جا چکی تھی۔ وہ شاید ہماری باتوں سے اکتا گئی تھی۔ رحمان سر جھکائے کھڑا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''بیٹھ جاؤ رحمان! کھڑے کیوں ہو!'' اور وہ میرا حکم سنتے ہی اس نرم بستر پر بیٹھ گیا جس کے اوپر مشعل روشن تھی۔ اب وہ پوری طرح روشنی میں تھا۔

اب جو بڑے ٹھاکر کی نظریں اس پر پڑیں تو وہ اس طرح اچھل پڑے جیسے انہیں بچھو نے ڈنک مار دیا ہو وہ حلق کے بل چیختے۔

رنجیتے! کیا تو مجھے پاگل کر دے گا۔ ارے یہ تو مجھے پولیس کا کوئی افسر لگتا ہے۔'' اور یہ کہتے ہی انہوں نے برابر دیوار سے لٹکتی ہوئی بندوق کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر رحمان کے سکون میں کوئی فرق نہ پڑا۔ وہ اسی طرح معصومیت سے بستر پر بیٹھا پلکیں جھپکا رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر بڑے ٹھاکر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ برہم ہو کر پلٹے۔ ''آخر تو کیا چاہتا ہے؟''

میں بولا ''صرف اسے یہاں رکھنا۔ آپ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ یہ ہر طرح میرے اور آپ کے حکم کا غلام ہے۔ اگر اس سے یہ کہہ دیں کہ یہ اپنا سر خود اپنے ہاتھ سے قلم کر لے تو آپ یقین کیجئے کہ یہ حکم کی تعمیل کرے گا۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولے۔ ''ہونہہ سر قلم کر لے گا کیا یہ تمہارے حکم پر اس جلتی ہوئی مشعل پر ہاتھ رکھ سکتا ہے؟'' انہوں نے مشعل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں ان کے اس مطالبے پر چکرا گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ سراسر درندگی ہے ایک شخص جو ہر طرح میرے قابو میں ہے اس کی وفاداری کا امتحان اسے اذیت دے کر لیا جائے۔ مگر یہ بات تو صرف میں جانتا تھا کہ رحمان ہر طرح اب

ہمارے بس میں ہے مگر بڑے ٹھاکر کو اس کا یقین کس طرح دلایا جا سکتا تھا اور پھر یہ پورا ماحول ہی وحشت اور بربریت پر زندہ تھا۔ یہاں آئے دن سوائے کشت وخون کے اور کوئی بات ہی نہ ہوتی تھی۔ جب سے میں نے ڈاکو رنجیت سنگھ کے جسم کو اپنی پناہ گاہ بنایا تھا نہ معلوم کتنے آدمیوں کا خون ہوتے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ حالانہ ابھی مجھے یہاں آئے صرف چند دن ہوئے تھے۔ ان چند دنوں میں اتنی تیزی سے میں اس قدر عجیب وغریب حالات سے دوچار ہوا تھا کہ میری عقل دنگ رہ گئی تھی میں انہی خیالوں میں کھویا رہتا اگر بڑے ٹھاکر کی گونجدار آواز مجھے نہ چونکا دیتی۔

وہ کہہ رہے تھے۔ ''چپ کیوں ہو گئے؟ جواب دو' کہاں گئے تمہارے دعوے۔''

میں نے کہا۔ ''مگر بابا یہ ظلم ہے ہمیں کیا حق ہے کہ ایک شخص کو بیٹھے بٹھائے تکلیف میں مبتلا کر دیں اور اپنی بے جا خواہش کا اسے شکار بنائیں۔''

میری بات سن کر بڑے ٹھاکر برس پڑے۔ ''اسے تو ظلم کہتا ہے' بے جا خواہش بتاتا ہے۔ کیا ہو گیا ہے تجھے؟ آنکھوں دیکھتے مکھی نگلنا چاہتا ہے آستین میں سانپ پالنا چاہتا ہے اور مجھے بتاتا ہے کیا میں نے اپنے بال دھوپ میں سفید کئے ہیں۔ آگ اور پانی کہیں ملے ہیں۔ دریا کے دو کنارے اگر مل سکتے ہیں تو پولیس ضرور ایک قانون شکن اور مجرم کی وفادار ہو سکتی ہے۔ تجھ پر اس شخص نے فریب ومکاری سے یقیناً کوئی جال پھینکا ہے۔ یہ بھی اس کی کوئی چال معلوم ہوتی

ہے۔ مجھے اس وقت تک اس کی وفاداری کا یقین نہیں آ سکتا جب تک یہ تیرے حکم ا ہاتھ مشعل پر نہ رکھ دے۔''

رحمان بھی یہ سب کچھ خاموشی سے سن رہا تھا۔ اور شاید میرے حکم کا منتظر تھا نے پہلی مرتبہ لب کشائی کی اور سر جھکا کر بولا۔''

''الربا! ان کی یہی مرضی ہے تو کیا حرج ہے سردار! میں اس کے لئے وں''

میں نے اس کی بات سنی اور پھر بڑے ٹھاکر کی ضد پر غور کیا اور مجبوراً مجھے ن کو حکم دینا ہی پڑا۔ وہ اطمینان سے اٹھا اور بایاں ہاتھ مشعل کے بھڑکتے ہوئے پر رکھ دیا۔ کمرہ زندہ گوشت کے جلنے کی بو سے بھر گیا۔ وہ بڑی قوت برداشت لک تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے تھے۔ بڑے ٹھاکر عجیب نظروں اسے گھور رہے تھے اور میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا میں نے چیخ کر کہا۔

''بس رحمان بس!'' اس نے اپنا جلا بھنا ہاتھ مشعل سے اٹھا لیا اور باوجود کے اس کے منہ سے ایک طویل کراہ نکل گئی۔ میں نے دیکھا کہ ٹھاکر اب کچھ ن ہو گئے ہیں، وہ اندر جھونپڑی میں گئے اور ایک بکسا اٹھا لائے اور خود اپنے سے رحمان کی مرہم پٹی کرنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر عجیب سی خوشی کا احساس غالباً بڑے ٹھاکر کو اب اس پر رحم آ چکا تھا۔

دوسری صبح ایک اور ہی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ہوا یہ کہ میں ا اور رحمان کو لے کر غار نما سرنگ کی طرف روانہ ہوا۔ جو کل پولیس کی گولہ باری

سے پوری طرح تباہ ہو چکی تھی اور آج صبح ہی سے جس کی مرمت کا کام شروع ہو گیا تھا میں نے روانہ ہونے سے پہلے آئی جی کے کپڑے بھی تبدیل کروا دیئے تھے او اس کی وردی احتیاط سے رکھوا دی تھی۔ اس کے جسم پر میرے کپڑے بالکل فٹ آ ے تھے۔ ہم تینوں ٹہلتے ہوئے کام کرنے والوں کے درمیان سے گزرتے رہے۔ شوبھا اس وقت بھی بیزار بیزار تھی۔ میں اس سے سبب دریافت کرنا چاہتا تھا۔ اور یہ جگہ کچھ الگ تھلگ سی بھی تھی۔ میں نے رحمان سے کہا۔ ''تم ذرا گھومو پھرو' ہم دونوں یہاں بیٹھے ہیں۔'' یہ جگہ ایک پتھر کے کٹاؤ سے باقی جگہ سے ذرا الگ ی ہو گئی تھی۔ زمین ریتلی تھی۔ غالباً ٹوٹ پھوٹ اور گرد و غبار اڑنے کی وجہ ورنہ پہلے تو جب میں اس جگہ سے گزرا تھا زمین تقریباً پتھریلی سی تھی۔ رحمان پیچھے ر گیا اور ہم دونوں اس جگہ بیٹھ گئے میں نے شوبھا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہی میری رس بھری؟ تم کچھ بجھی بجھی سی لگتی ہو۔''

اور یہ کہہ کر اس کے ہونٹ چوم لئے وہ خود سپردگی کے انداز میں میری آغوش میں سمٹ آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں دنیا جہاں سے بے خبر کیف و سرور کی اتھاہ گہرائیوں میں سفر کر رہے تھے۔ جیسے میں لذت و سرور کے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا۔

اس کا بدن ایسا ہی تھا کہ شاید کوئی پارسا سے پارسا اس کے قرب کی گرمی محسوس کر کے بغیر پگھلے نہیں رہ سکتا تھا

اور میں تو اس پر خیر دل و جان سے فدا تھا ہی۔ مجھے اس کے قرب نے ا

بے خود کر دیا کہ میں نے یہ ہوش بھی کھو دیا کہ پاس ہی لوگ موجود ہیں، جو مجھے اور شوبھا کو سگا بہن بھائی سمجھتے ہیں۔ میں جو سردار رنجیت سنگھ نہیں علی حسن تھا۔ مگر میرا جسم رنجیت سنگھ کا تھا۔ اس رنجیت سنگھ کا جو اس لڑکی کا بھائی تھا جس کے لئے میں اس وقت صرف ایک محبوب اور خوبصورت مرد تھا اور کچھ بھی نہیں۔ ہم دونوں اسی بے خودی میں یک جان دو قالب ہوئے ریت میں سرار رہے تھے کہ اچانک مجھے ایک شور نے چونکا دیا۔ یہ بہت سے لوگوں کی ملی جلی آوازوں کا شور تھا۔ جو ہم دونوں کے پاس کھڑے تھے۔ ان میں تقریباً سبھی نوجوان تھے۔ وہ سخت برہم اور ناراض نظر آ رہے تھے اور ان کے چہروں پر عجیب قسم کی درندگی رقص کر رہی تھی۔

وہ کہہ رہے تھے۔ ''بالکل کل جگ ہے...... کیا کوئی بغیر یہ منظر دیکھے یقین کر سکتا تھا کہ دو بہن بھائی اتنی ذلیل اور نیچ حرکت کر سکتے ہیں ہمیں سردار سے ایسی امید نہیں تھی۔ ہمارا سردار اتنا گھٹیا اور نیچ نہیں ہو سکتا۔ ہماری بہنوں اور ماؤں کی عزت بھی محفوظ نہیں۔ جب یہ خود اپنی بہن کے ساتھ منہ کالا کر سکتا ہے تو ہم تو پھر غیر ہیں۔'' غصے اور نفرت میں ڈوبی ہوئی ان آوازوں نے مجھے مبہوت سا کر دیا اور مجھے ایسا لگا کہ میں اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا مجھے شرمندگی اور خفت کا احساس ہو رہا تھا۔

ان میں سے پھر کسی نے کہا۔ ''قانون سب کے لئے برابر ہے۔ قانون اگر اس جرم پر دوسروں کو گولی مارنے کی سزا دے سکتا ہے تو سردار کو بھی یہی سزا ملنی چاہئے۔ ہم اپنا سردار کسی اور کو بنالیں گے۔ یہ تو ہماری عزت و ناموس پر ایک داغ

ہے۔اسے فوراً رنگے ہاتھوں پکڑ لینا چاہئے۔! اچانک ان ہی آوازوں میں سے
ایک آواز ابھری۔

''اگر کسی نے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کی تو گولی ماردوں گا۔ یہ آواز آئی
جی رحمان کی تھی۔ دوسری آواز ابھری ''پیچھے ہٹ جاؤ'' ورنہ تر پر جہنم کا دہانہ کھول
دوں گا۔'' یہ غیظ میں ڈوبتی ہوئی آواز گرنام سنگھ کی تھی اور اسی کے ساتھ دو آوزیں
ابھریں۔

''تم سردار کو ہاتھ نہیں لگا سکتے''

''اگر کسی نے ایسی کوشش کی تو پہلے اسے ہماری لاشوں پر سے گزرتا پڑے
گا۔''

یہ اعتماد میں ڈوبی ہوئی دو آوازیں رام سروپ اور چرنجی کی تھیں۔ وہ
چاروں 'رحمان' گرنام سنگھ' رام سروپ اور چرنجی مجمع کے بالکل سامنے بندوقیں
تان کر کھڑے ہو گئے۔ میرے چار جان نثار' اب مجھے انہوں نے مجمع کی نظروں
سے قطعی چھپا دیا تھا۔ وہ میرے اور مجمع کے درمیان ایک آہنی دیوار بن گئے تھے۔
مجھے اب کچھ ہوش آیا اور شبھا بھی جو مبہوت سی ہو کر رہ گئی تھی اچانک ان چاروں کی
آواز سے چونک کر کسمسائی۔ اس نے جلدی جلدی اپنے بکھرے ہوئے بال اور
کپڑے درست کئے اور میں بھی جلدی سے اٹھ کر اپنے آپ کو سنبھالنے لگا۔ اس
سب ہنگامے کی وجہ صرف شوبھا تھی۔ شاید ہی بستی کا کوئی نوجوان ایسا ہو جو شوبھا
کے حسن کو دیکھ کر ایک دفعہ متاثر نہ ہوا ہو' وہ تھی بھی تو قیامت اس تمام روئیے میں وہ

ت بھی چھپی ہوئی تھی جو اس وقت مجھے شوبھا کے ساتھ اس حالت میں دیکھ کر
کے دلوں کو چھید گئی تھی۔ وہ اسی لئے اور برہم ہو گئے تھے۔ جیسے انہیں کوئی
ورت بہانہ مل گیا ہو مگر وہ آئی جی رحمان گرنام سنگ' رام سروپ اور چرنجی کے
ہ وئیے کے متوقع نہیں تھے اور پھر آئی جی رحمان سے تو سوائے گرنام سنگھ کے
ہرے اس وقت یہاں کوئی آشنا ہی نہیں تھا۔ گرنام سنگھ' رام سروپ اور چرنجی کا
، کے نوجوانوں پر خاصا اثر تھا، اس لئے وہ آگے بڑھنے کی جرات نہ کر سکے۔
شاید وادی میں آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ اسی لئے مجمع لحہ بہ لحہ بڑھتا جارہا
رحمان اور گرنام سنگھ وغیرہ جو مجھے اور شوبھا کو چاروں طرف گھیرے ہوئے
۔ہم دونوں کو لئے ہوئے مجمع کو چیرتے ہوئے اس طرح نکل گئے جیسے صابن
ار۔ وہ چاروں ہم دونوں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ ان
ں نے بحفاظت مجھے اور شوبھا کو میرے جھونپڑے تک پہنچایا اور خود
ڑے کے سامنے بندوق لے کر کھڑے ہو گئے جھونپڑا اس وقت خالی پڑا
نہ معلوم بڑے ٹھاکر اور ٹھکرائین کہاں چلے گئے تھے کیا خبر ان تک بھی یہ اطلاع
ہچکی ہو۔ میں نے جھونپڑے میں گھس کر دیکھا بڑے ٹھاکر کی بندوق دیوار پر
دنہیں تھی۔ ہمیں ابھی جھونپڑے میں آئے کچھ دیر ہی ہوئی ہوگی کہ میں نے
ڑے کے باہر بڑے ٹھاکر کی گرجدار آواز سنی جو کہہ رہے تھے۔

''کہاں ہے رنجیتے؟ میں اسے گولی ماردوں گا۔'' ان کے ساتھ غالباً بستی
ورلوگ بھی تھے۔ رحمان کی آواز سنائی دی۔'' بابا آپ جھونپڑے میں داخل

نہیں ہوسکتے اور آپ ہی کیا کوئی بھی بغیر میری لاش پر سے گزرے سردار تک
نہیں پہنچ سکتا۔‘‘ اس کا ایک ہاتھ زخمی ہونے کے باوجود اس کی ہمت وجرات قابل
دید تھی۔ رات کا واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہوگیا جب اس نے میرے حکم پر جلتی
ہوئی مشعل پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

رحمان پھر بولا۔ ’’تمام وادی کے لوگ سردار کی جان کے دشمن ہوگئے ہیں
اور انہیں مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے تیور بھی خطرناک ہیں
اس لئے آپ بھی اس وقت جھونپڑے میں داخل نہیں ہوسکتے جب تک اپنی
بندوق ہمیں نہ دے دیں اور سردار خود آپ کو اندر آنے کی اجازت نہ دے دیں۔‘‘

اس کے جواب میں بڑے ٹھاکر اور برہم ہوگئے۔ بستی کے دوسرے لوگ
جو اس وقت غالباً بڑے ٹھاکر کے ساتھ تھے۔ انہیں سمجھانے لگے۔ ایک آواز آئی جو
چار کسی ضعیف آدمی کی آواز لگتی تھی۔

’’بڑے ٹھاکر اپنا خون اپنا ہوتا ہے‘ اپنی اولاد پھر اپنی ہوتی ہے‘ نہ معلوم
رنجیت سنگھ کس کی اولاد ہے۔ اب تو مجھے یاد بھی نہیں ‘ شاید وہ کوئی بنیا تھا
بڑے ٹھاکر.....‘‘

مگر شاید بڑے ٹھاکر اس وقت کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں تھے میں ا
بات سن کر عجیب کشمکش میں پڑ گیا۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ کون بنیا؟...... کیا رنجیت سنگھ
جس کے جسم میں اس وقت میں ہوں بڑے ٹھاکر کی اولاد نہیں؟ دوسرے اور لوگ
بھی بڑے ٹھاکر کو سمجھا رہے تھے۔ ان کی آوازیں بھی ضعیف ہی سی تھیں وہ کہہ رہے

۔

’’بڑے ٹھاکر‘ کون سا ایسا پاپ ہوگیا جو آپ رنجیت سنگھ کو گولی مار دینا
چتے ہیں۔ اس نے اپنی سگی بہن کے ساتھ تو کوئی برا کام نہیں کیا۔
رنجیت سنگھ کو آپ نے گود ہی تو لیا تھا۔ کون سا وہ آپ کا خون ہے۔ اگر وہ
کا خون ہوتا تو اس سے ایسی خطا ہی کیوں ہوتی۔‘‘

لوگوں کے سمجھانے بجھانے سے شاید بڑے ٹھاکر کچھ نرم پڑے......
ڑے کے باہر غالباً کچھ جوان پہنچ گئے تھے جو شاید شوبھا کے امیدواروں میں
تھے۔ ایک بوڑھے کی آواز پھر سنائی دی۔

’’بیٹا‘ وہ رنجیت، شوبھا کا بھائی ہرگز نہیں‘ مجھے اب تک یاد ہے‘ آج سے
تمیں برس پہلے کی بات ہے کہ ایک گاؤں میں ڈاکے کے دوران بڑے ٹھاکر
جو اس وقت ہمارے سردار تھے رنجیت کو ایک گھر سے اٹھا لیا اس وقت یہ بالکل
ا‘ کوئی ایک سال کا مشکل سے ہوگا سردار ٹھاکر بلبیر سنگھ کے کوئی اولاد نہیں
۔ انہوں نے اس لڑکے کو پال لیا اور اس کا نام رنجیت سنگھ کے کوئی اولاد نہیں
۔ انہوں نے اس لڑکے کو پال لیا اور اس کا نام رنجیت سنگھ رکھا، بعد میں سردار
ڑ کا ہوا بھی مگر وہ زیادہ دیر نہیں رہ سکا۔ اس کے کافی عرصے بعد شوبھا ہوئی۔
یہ اصل خون ہوتا تو پھر کاہے کا رونا تھا۔ یہ تو بنئے کی اولاد ہے ٹھاکر نہیں ہے۔‘‘
ں ایسی آوازوں نے تمام معاملہ صاف کر دیا اور میں نے ایک سکون کا سانس لیا‘
تمام معاملہ مجھ پر روشن تھا میں نے نہ جانے کیا سوچ کر رحمان اور گرنام وغیرہ

سے کہا۔

''بڑے ٹھاکر کو اندر آنے دو مع بندوق کے۔''

میں نے اور زوروں سے کہا۔'' رحمان' گرنام اور رام سروپ میں سے کچھ جان چکا ہوں کہ میں بڑے ٹھاکر کی اولاد نہیں ہوں۔ مگر انہوں نے مجھے اولاد کی طرح پالا ہے اگر یہ مجھے گولی مار دینا چاہتے ہیں تو میرا سینہ حاضر ہے۔''

میری بات سن کر ان لوگوں نے صرف بڑے ٹھاکر کو اندر آنے دیا۔ بندوق ان کے ہاتھ میں تھی۔

جیسے ہی بڑے ٹھاکر اندر داخل ہوئے میں اور شوبھا جو سب کچھ خود بھی سن چکی تھی' اٹھ کھڑے ہوئے اور میں نے سینہ کھول کر کہا۔

''بابا چلایئے گولی۔''

شوبھا یہ دیکھ کر میرے سامنے آ گئی' میں نے ہاتھ سے اسے ایک طرف ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ نہ ہٹی اور بولی

''اگر بابا' میرا سہاگ اجاڑنا ہی چاہتا ہے تو میں بھی کیوں زندہ رہوں۔ بابا! مجھے بھی اسی کے ساتھ گولی مار دے۔'' ہم دونوں کی بات سن کر بڑے ٹھاکر کے ہاتھ ذرا سے کانپے اور اٹھی ہوئی بندوق جھکتی چلی گئی اور ان کے رخساروں پر دو آنسوؤں کے قطرے لڑھک گئے اور وہ '' میرے بچو! کہہ کر آگے بڑھے۔ میں اور شوبھا ان کے سینے سے لگ گئے اب میں اور شوبھا بھی ان کے سینے سے لگے ان کے سینے کو اپنے آنسوؤں سے بھگو رہے تھے۔ ابھی ہم دونوں بڑے ٹھاکر کے

سے لگے ہوئے تھے کہ بڑی ٹھاکرائین جھونپڑے میں گھبرائی ہوئی داخل ہوئیں اور یہاں کا منظر دیکھ کر خود ان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے شاید یہ خوشی کے آنسو تھے بڑے ٹھاکر کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ رندھے ہوئے گلے کے ساتھ بولے۔

''شوبھا کی ماں! میں نے ان دونوں کو معاف کر دیا۔'' اور یہ کہہ کر بڑے ٹھاکر جھونپڑے کے باہر نکلے جہاں تمام وادی کے جوان جمع ہو گئے تھے' انہوں نے ان کو مخاطب کر کے کہا۔

''میرے بچو! تم جان ہی چکے ہو گے کہ تمہارا سردار رنجیت میری اصل اولاد نہیں ہے اور وہ شوبھا کا سگا بھائی نہیں۔ اس لئے آج ہی میں ان دونوں کا بیاہ کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تقدیر میں یہی تھا اور شاید بھگوان کی بھی یہی مرضی تھی۔ ورنہ رنجیت کی منگیتر لاجو کو اس دنیا سے بھگوان نہ اٹھاتے۔ اب تم لوگ اپنے اپنے کام پر لگ جاؤ''

بڑے ٹھاکر کی بات سن کر تمام مجمع منتشر ہو گیا۔ سوائے رحمان اور گرنام وغیرہ، کے جو اب جھونپڑے میں بڑے ٹھاکر کے ساتھ ساتھ ہی داخل ہو رہے تھے۔ بڑے ٹھاکر کا اعلان شوبھا نے بھی سن لیا اور وہ شرما کر جھونپڑے کے اندر والے حصے میں بھاگ گئی تھی۔ مجھے مبارکباد دینے والوں میں سب سے پہلا شخص گرنام سنگھ تھا۔ لاجو کا بھائی۔ اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا اور مجھے اس کی بات کا پہلی دفعہ احساس ہوا۔ میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ یقیناً بڑے صبر اور

حوصلے کا آدمی تھا۔ اس کی مرحوم بہن کا منگیتر کسی دوسرے کے ساتھ شادی کر رہا تھا اور اب اس پر یہ بھی ظاہر ہو چکا تھا کہ میں اس کی بہن کا وفادار نہیں تھا بلکہ کسی اور سے محبت کرتا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کے دل میں میری محبت کم نہ ہوئی تھی۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن کی وفاداریاں مشروط نہیں ہوتیں۔ گرنام سنگھ ایسے ہی لوگوں میں تھا جس کا مجھے اب پوری طرح اندازہ تھا رحمان، رام سروپ اور چرنجی نے بھی باری باری مبارکباد دی۔

اس بھاگ دوڑ میں شاید رحمان کے ہاتھ کا زخم پھر تکلیف دینے لگا تھا اور پٹی خون میں تر ہو گئی تھی۔ یہ دیکھ کر بڑے ٹھاکر نے اس سے کہا!

''بیٹا رحمان! جا ذرا اندر سے چھوٹا سا بکس اٹھا لا۔ تیری پٹی بدل دوں۔ انہوں نے اس محبت سے اسے مخاطب کیا تھا کہ میں نے سوچا کہ اب یقیناً انہیں رحمان پر پورا بھروسہ ہو چکا ہے۔ رحمان نے ان کی بات بات سن کر کہا۔'' اچھا بابا۔'' اور جھونپڑے کے اندر چلا گیا۔ میں نے گرنام سنگھ سے کہا۔'' گرنام! میں ذرا قید خانے تک چلتا ہوں تم تینوں میرے ساتھ چلو۔ اور ہاں یہ بتاؤ گرنام! کام کی کیا رفتار ہے؟ غار نما سرنگ کی جب تک تعمیر مکمل نہ ہو جائے ہم قطعی غیر محفوظ ہیں۔'' بڑے ٹھاکر بھی میر بات کی تائید کی جو اس وقت رحمان کے ہاتھ سے پٹی کھولنے میں مصروف تھے گرنام سنگھ کا جواب تھا۔

''سردار...... یہ آپ بالکل صحیح کہتے ہیں، ہم اس وقت تک خطرے میں ہیں جب تک یہ رستہ بند نہیں ہو جاتا۔ مگر کیونکہ ایک تو پہلے راستے کو چوڑا کرنا ہے،

میں وقت لگے گا دوسرے یہ کہ ہمارے پاس آدمی کم ہیں۔''

میں نے کہا'' تمہیں کتنے اور آدمی مل جائیں تو تم جلد سے جلد یہ کام پورا کر لو گے؟

وہ میری بات پر پہلے تو حیران ہوا اور پھر بولا'' آدمی کہاں سے آئیں ئے؟ سردار! تمام ہی وادی کے جوان میں نے اس کام پر لگا دیتے ہیں۔'' وہ پھر ا۔ ہاں ایک ترکیب ہو سکتی ہے جو شاید آپ نے بھی سوچی ہو۔ وہ یہ کہ سپاہیوں ے زبردستی کام کرایا جائے مگر ایسا کرنا خطرناک ہو گا سردار''

میں اس کی بات سن کر ہنسا۔ بڑے ٹھاکر نے بھی گرنام سنگھ کی تائید کی ی۔'' رنجیتے! ایسا کرنا خطرناک ہے۔''

'' آؤ رحمان! ہم باہر چلتے ہیں۔ چلو تم لوگ بھی ساتھ چلو۔'' میں نے نام سنگھ، رام سروپ اور چرنجی سے کہا۔ بڑے ٹھاکر اس عرصے میں رحمان کی پٹی یل کر چکے تھے۔ ہمیں باہر جاتا دیکھ کر وہ بولے۔'' یہ نہ بھول جانا کہ آج تمہاری ی ہے۔ جلد لوٹ آنا'' جا تو رہے ہو۔'' اور میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گے بڑھ گیا۔

یکے بعد دیگرے میں اتنی تیزی کے ساتھ حالات سے دو چار ہوا تھا کہ ڑی دیر کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا تھا جس سے میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہ ے۔ میں اپنے چاروں ساتھیوں کے ہمراہ گھوڑے پر قید خانے کی طرف روانہ ا۔ میں نے چلتے چلتے اپنا گھوڑا گرنام سنگھ کے قریب کر لیا۔'' ہاں تو گرنام، کیسی

رہے‘ اگر اس آئی جی کی طرح بقیہ پولیس والے بھی تمہارے سردار کا دم بھرنے لگیں۔‘‘

گرنام سنگھ کے لئے یہ اطلاع کسی ایٹم بم کے دھماکے کی طرح تھی۔ وہ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ایک دم چونک پڑا۔

’’سردار! ایسا کیجئے گا بھی مت‘ اگر آپ نے کسی طرح ایک آدمی کو قابو میں کرلیا ہے تو اتنی بڑی پلٹن کی پلٹن کو اپنے بس میں کرنا ناممکن ہے۔ یہ خطرہ مول لینا...... میں سمجھتا ہوں کہ......‘‘ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

میں نے کہا۔’’ ہماری زندگی ہی خطروں سے کھیلنا ہے‘ کل تمہارے ساتھیوں کی تعداد ایک ہزار ہوچکی ہوگی۔ کیا خیال ہے؟‘‘ وہ حیران حیران سا میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے ذرا راز دارانہ لہجے میں کہا۔ کیا تم یقین کرو گے کہ رحمان اپنی پچھلی زندگی قطعی بھول چکا ہے اور سوائے اس کے کچھ نہیں جانتا کہ وہ تمہارا ساتھی ہے‘‘ گرنام سنگھ کے لئے یہ بات بھی کچھ کم عجیب نہیں تھی۔ میں نے پھر کہا۔’’اور اسی طرح بقیہ تمام سپاہی بھی قطعی سب کچھ بھول جائیں گے۔ اور انہیں سوائے اس کے اور کچھ یاد نہیں رہ جائے گا کہ ان کا سب کچھ میں ہوں۔ اور وہ میرا حکم ماننے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔‘‘

گرنام سنگھ سے اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے ہم سب قید خانے تک پہنچ گئے اور اب میں نے رام سروپ کو تو ایک بڑے ہال کے دروازے پر مقرر کیا

اور جرنجی کو اس نشست نما کمرے کے دروازے پر جس میں کل رات میں اور شوبھا آکر بیٹھے تھے اور گرنام سنگھ کو یہ حکم دیا کہ تم ایک ایک کر کے تمام سپاہیوں کو یہاں میرے پاس لاتے رہو۔ رحمان کو اس ڈیوٹی پر مقرر کیا کہ وہ میرے پاس رہے اور جو سپاہی بھی آئے اس سے صرف اتنا کہے کہ تم خاموشی سے سردار کے سامنے کھڑے رہو اور اگر کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ رحمان کو میں نے سمجھایا‘ وہ میرے اس عجیب حکم پر پہلے کچھ حیران سا ہوا پھر سر ہلا کر بولا’’بہتر ہے سردار!‘‘

اب ایک ایک کر کے سپاہیوں کو میرے پاس لایا جانے لگا۔ پہلے سپاہی نے آتے ہی آئی جی رحمان کو سلوٹ کیا۔ وہ حیران سا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے میرے کہے ہوئے جملے دہرا دیئے۔ وہ سپاہی خاموش کھڑا ہو گیا اور میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ کم سے کم وقت میں زیادہ سپاہیوں کو نمٹا دینا چاہتا تھا۔ جب وہ میرے پاس سے واپس جائے تو سب کچھ بھول چکے ہوتے سوائے اپنے نام ذہنی صلاحیت اور تعلیم کے انہیں کچھ یاد نہ رہ جاتا۔

ان کا ڈی آئی جی ایک انگریز تھا جس کا نام ڈیسوزا تھا میں اسی کی تلاش میں تھا جب مجھے اس کا نام وغیرہ ایک سپاہی سے سوالات کے دوران معلوم ہو گیا تو اس مرتبہ میں نے گرنام سنگھ کو حکم دیا کہ’’ دیکھو ان سپاہیوں میں کوئی انگریز ہو گا جس کا نام ڈیسوزا ہے‘ اب سب سے پہلے اسے لاؤ۔‘‘ نیا کپڑا گرنام سنگھ تھوڑی دیر میں ایک گوری چمڑی والے کو لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ یہ شخص تقریباً 40 سال

کا ایک تندرست جسم کا مالک تھا۔ بھاری جبڑے اور چھوٹی چھوٹی بھوری آنکھیں
جن سے عیاری جھلکتی تھی' اس نے بھی آتے ہی آئی جی رحمان کو سلوٹ کیا اور
انگریزی میں اس سے کچھ کہا۔ رحمان نے انگریزی ہی میں غالباً میری بتائی ہوئی
بات دہرادی اور وہ او کے کہہ کر خاموش کھڑا ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی
عیار آنکھیں میری طرف اٹھیں اور پھر میری آنکھوں سے جدا نہ ہو سکیں۔ اس نے
لاکھ چاہا کہ کسی اور طرف دیکھ سکے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ اسے ایک جھٹکا لگا اور ساتھ ہی
مجھے بھی۔

مجھے اب اتنا تناؤ نہیں محسوس ہو رہا تھا میں نے اس کے ذہن سے سوال
کیا۔ ''ڈیسوزا! یہ بتاؤ کہ تمہیں ہمارے ٹھکانے کا پتا کس طرح چلا؟'' اس نے کچھ
دیر مدافعت کی مگر میرے ایک ہی جھٹکے نے اس کے ہوش ٹھکانے کر دیئے۔ وہ
ذہنی جھٹکا اس کے لئے پہلے سے بے حد شدید ثابت ہوا۔ اس لئے کہ میں پہلے ہی
اسے کئی ذہنی جھٹکے دے چکا تھا۔ رحمان نے گھبرا کر پہلو ضرور بدلا۔ وہ حیران تھا کہ
ڈیسوزا بغیر مارے پیٹے کیوں چیخ رہا ہے؟ مجھے اس سے جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ
پولیس کے تجربہ کار افسروں کے ساتھ خود ڈسوزا نے کرتار کا پیچھا کیا تھا اور وہ
ساری اسکیم ڈیسوزا ہی کے ذہن کی تھی کہ کرتار کو قیدیوں کے لباس میں
پہاڑیوں میں چھوڑ دیا جائے۔ اور کرتار پھر یہاں سے اسی کے پاس پہنچا تھا کہ
فلاں راستے سے آج رنجیت سنگھ گزرے گا۔ ڈیسوزا نے اسے چھوڑ دیا کہ وہ واپس
چلا جائے اور خود کچھ ذمے دار افسروں کے ساتھ اس کا پیچھا کر کے ٹھکانے کا پتا چلا

لیا تھا، اُن میں رحمان بھی تھا۔ اور باقی جو لوگ ٹھکانے کے پتے سے واقف تھے وہ
بھی سب اس وقت حملے میں ڈیسوزا آئی۔ جی رحمان کے ساتھ آئے تھے۔ تاکہ
رنجیت سنگھ کو گرفتار کرنے کا سہرا اُن کے سر بھی بندھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ سب
تیاری ڈیسوزا نے آئی جی رحمان سے مل کر راتوں رات کر لی تھی اور اس جلدی میں
کوئی ریکارڈ تیار نہیں کیا تھا۔ مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ کا فائل آج سے کچھ برس پہلے اسی
وقت بند کر دیا گیا تھا۔ جب ایک نقلی رنجیت سنگھ کو اصلی ثابت کر کے پولیس نے
پھانسی دے دی تھی۔ حالانکہ وہ کوئی چھوٹا موٹا ڈاکو تھا جس کا نام پولیس کے ریکارڈ
میں موجود نہیں تھا۔

یہ سب معلومات حاصل کرنیکے بعد میرے دل کو اطمینان ہوا کہ خدا کا
شکر ہے کہ اور کوئی ٹھکانے سے واقف نہیں۔ پھر تو چند لمحوں بعد ہی ڈیسوزا بھی
میرے ساتھیوں میں شامل ہو چکا تھا۔ میرا جانی دشمن ڈیسوزا اب میرے لئے جان
بھی دے سکتا تھا۔ ڈیسوزا کے بعد وہ انسپکٹر بھی آئے جو ٹھکانے سے واقف تھے ان کا بھی
وہی حشر ہوا۔

میں چاہتا تھا کہ جلد سے جلد بقیہ حضرات کو بھی نمٹا دوں اور کچھ ہی
دیر میں میں نے تمام سپاہیوں کو واقعی فارغ کر دیا' اب وہ سب میرے آدمی تھے۔
میں نے اپنے کام سے فارغ ہو کر گرنام سنگھ سے کہا۔ ''ان سب لوگوں کو اب قید
خانے سے نکالو اور اس کام پر لگا دو کہ یہ خود اپنی جھونپڑیاں تعمیر کریں۔ بقیہ لوگوں کو
بھی انہیں کے ساتھ جھونپڑیوں کی تعمیر پر لگا دو' اس غار نما سرنگ کا کام اس کے بعد

شروع ہوگا' اسلئے کہ اب کوئی ایسی خطرے والی بات نہیں ہے۔ جب یہ لوگ جھونپڑے تعمیر کرچکیں تو ان کی رائفلیں اور بقیہ اسلحہ بھی انہیں بانٹ دو۔'' میرے اس حکم پر گرنام سنگھ نے سر جھکا لیا۔ میں نے پلٹ کر کہا۔ ''تمام وادی والوں سے کہدو کہ ان لوگوں پر پورا اعتماد کریں اور ان سے سوالات نہ کریں' اس لئے کہ وہ اب انہیں کچھ بھی نہیں بتا پائیں گے ان سے کہدو یہ میرا حکم ہے اگر اس کے خلاف ہوا تو نتیجے میں انہیں سوائے پریشانی اور ذلت کے اور کچھ نہیں ملے گا۔ اور ہاں سنو! غالباً اب شام ہو چکی ہے اگر تم چاہو تو کل سے یہ کام شروع کرایا جاسکتا ہے' آج انہیں یہیں رہنے دو' باہر کہاں رہیں گے بلکہ جب تک جھونپڑے تعمیر نہیں ہو جاتے انہیں یہیں رکھو۔ رات یہ یہاں گزارا کریں گے۔''

اس پر گرنام سنگھ بولا۔ ''سردار! آج آپ کی شادی بھی تو ہے' اگر یہ لوگ بھی اس میں شریک ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟ میں نے گرنام سنگھ کی تجویز سے اتفاق کیا۔

اب یہ پورے سات آٹھ سو آدمی میرے ہمراہ بستی کی طرف بڑھے...... انہیں دیکھ کر بستی میں کھلبلی مچ گئی وہ لوگ یہ سمجھے کہ یہ لوگ شاید قید خانے سے آزاد ہو کر زبردستی نکل آئے ہیں' یہ دیکھنا تھا کہ ایک دم میرے دیکھتے دیکھتے سامنے سے انہوں نے فائرنگ شروع کر دی' یہ شام کا وقت تھا اور سورج ابھی پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا۔ تمام سپاہی اپنی اپنی وردیوں ہی میں تھے۔ یہ دیکھ کر وادی کے لوگ غالباً بھڑک گئے اور انہوں نے اس بات پر بھی غور نہیں کیا

انکے ہاتھ خالی ہیں اور ان کے ساتھ میں گرنام سنگھ اور رام سروپ وغیرہ بھی ں۔ انہوں نے سامنے مورچے سنبھال لئے اور وہ برابر فائرنگ کر رہے تھے۔ یہ ورت حال نہایت خطرناک تھی۔ ہم چاروں گھوڑوں سے کود کر زمین پر لیٹ ے۔ اور بقیہ لوگوں کو بھی میں نے چیخ کر حکم دیا کہ زمین پر لیٹ جاؤ۔ مگر وہ میرے م سے پہلے ہی زمین پر لیٹ چکے تھے اس لئے کہ ان کی ذہانت اور صلاحیت زار تھی اور بہر حال وہ سپاہی تو تھے ہی۔ صورت حال یہ تھی کہ سامنے سے رنگ برابر ہو رہی تھی اور ہم سب زمین پر اوندھے پڑے تھے اور ہمارے سروں ے گولیاں سائیں سائیں کرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

گولیاں اس طرح سنسناتی ہوئی ہمارے سروں سے گزرتی رہیں اس رت حال نے کچھ دیر کے لئے میرے بھی اوسا خطا کر دیئے۔ سب سے آگے ہم روں ہی تھے۔ میں نے سینے کے بل سرک کر گرنام سنگھ کے قریب ہو گیا اور اس ے کہا۔ ''گرنام ایسا کرو کہ تم اسی طرح سینے کے بل رینگتے ہوئے ذرا چکر کاٹ کر پے سے وادی والوں تک پہنچو اور انہیں صورت حال سے آگاہ کرو اور کسی طرح رنگ بند کراؤ۔'' وہ میرے حکم پر سینے کے بل رینگتا ہوا پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ مجھے ی والوں کی حماقت پر سخت غصہ آ رہا تھا۔

جنہوں نے بے سوچے سمجھے ہم پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ ہم اسی طرح سادھے پڑے رہے۔ خدا خدا کر کے سامنے سے فائرنگ بند ہوئی۔ شاید گرنام ہ وہاں پہنچ چکا تھا۔ یہ دیکھ کر میری جان میں جان آئی اور ہم سب لوگ اٹھ کر

کھڑے ہوئے۔ ہم جب وادی والوں کے قریب پہنچے تو وہ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔

وادی میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بڑے میدان میں شادی کی تقریب کا انتظام کیا گیا ہے اور اس وقت بڑے ٹھاکر وہیں پر ہیں۔ بڑے بڑے شامیانے وہاں نصب تھے جو یہاں سے بھی نظر آ رہے تھے۔ فائرنگ کی آواز بڑے میدان تک پہنچ گئی تھی۔ اس لئے بڑے ٹھاکر بھی کچھ دیر پہلے اسی مجمع میں موجود تھے۔ مگر صورت حال کا علم ہونے کے بعد وہ گرنام سنگھ سے یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ ''رنجیت کو فوراً میرے پاس بڑے میدان میں بھیجو۔'' مجھے گرنام سنگھ نے بڑے ٹھاکر کے حکم سے آگاہ کیا۔ میں تمام سپاہیوں کے ہمراہ بڑے میدان میں پہنچا جہاں بہت سے لوگ جمع تھے اور بڑے بڑے شامیانوں، قناتوں اور فرشوں سے پورے بڑے میدان کو سجا دیا گیا تھا۔ مشعلیں بھی جگہ جگہ پہلے ہی سے لگا دی گئی تھیں ہر چند کہ انہیں ابھی روشن نہیں کیا گیا تھا۔ تمام میدان سپاہیوں اور وادی والوں سے بھر گیا۔ چبوترے پر منڈپ بنایا گیا تھا جس پر میری اور شوبھا کی شادی کی رسوم طے ہونی تھیں۔ بڑے ٹھاکر نے مجھے دیکھ کر پہلے تو سپاہیوں کے بارے میں خاصی لعن طعن کی۔ جب میں نے انہیں پوری طرح یقین دلا دیا کہ یہ لوگ ہر طرح میرے وفادار ہو چکے ہیں تو انہیں کچھ یقین آیا۔

میں ابھی نہا دھو کر کپڑے ہی تبدیل کر پایا تھا کہ چرنجی گھبرایا ہوا جھونپڑے میں داخل ہوا اور بولا۔ ''سردار! غضب ہو گیا۔ وہ تو بھگوان نے کرپا

ردی اور بڑے ٹھاکر بیچ میں آ گئے ورنہ سپاہیوں اور وادی والوں میں بڑی بردست جھڑپ ہو جاتی۔ دو سپاہی مارے گئے ہیں اور ایک ہمارا آدمی۔''

میں نے اس کی بات سن کر ذرا سختی سے کہا۔ ''ہمارا آدمی کیا مطلب؟ کیا ب وہ تمام سپاہی تمہارے ساتھی نہیں ہیں۔''

وہ کچھ سٹپٹایا اور بولا۔ ''نہیں سردار، میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ بہر حال ب سپاہی بڑے ٹھاکر کے قبضے میں بھی نہیں آ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ'' ہم ردار کے ایک دشمن کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے اور سخت برہم ہیں۔''

''تم پوری بات تو بتاؤ چرنجی ہوا کیا؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

وہ بولا ''ہوا یہ سردار کہ پہلے پہل تو وادی والے کچھ نوجوان ان میں سے ت سے سپاہیوں کا مذاق اڑاتے رہے اور خاص طور پر اس سفید چمڑی والے کا جو ٹی پھوٹی ہماری زبان بولتا ہے۔ لیکن جب چند نوجوانوں نے آپ کے لئے کچھ ستاخانہ جملے استعمال کئے تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئے۔ پہلے تو ہاتھا پائی ہوئی۔ پھر یک نوجوان نے اپنی بندوق لوڈ کر کے ایک سپاہی کو ٹھکانے لگا دیا۔ پھر کیا تھا بہت سے سپاہی اس پر پل پڑے اور مار مار کر اسے لب دم کر دیا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو پ کو اور شوبھا رانی کو سب سے زیادہ برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اس کا نام موتی تھا۔ یہ ا بھتیجہ اور رام سروپ کا لڑکا تھا تھوڑی دیر بعد وہ مر گیا۔ میرے بڑے لڑکے نے یہ دیکھ کر پھر بندوق لوڈ کی اور ایک سپاہی کو ٹھکانے لگا دیا اور کئی کو زخمی کر دیا سنتا روق نہ رکھتا مگر بڑے ٹھاکر بیچ میں آ گئے اور وہ ان کا احترام کر کے خاموش

ہوگیا۔ مگر سپاہی برابر بڑے ٹھاکر سے یہی مطالبہ کر رہے ہیں کہ اس نوجوان کو ہمارے حوالے کردو' دراصل میرا لڑکا سنتا اپنے چچا زاد جوان بھائی کی موت برداشت نہ کرسکا اور غصے میں آ گیا۔ میں آپ سے یہ بھی نہیں چھپاؤ نگا کہ آپ کی بڑھ چڑھ کر برائی کرنے والوں میں میرا لڑکا سنتا بھی شامل تھا جس پر میں نے اسے ڈانٹا بھی۔ مگر میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں اس کی وجہ رقابت تھی وہ شوبھا رانی کو چاہتا ہے۔ دبی دبی زبان میں اپنی ماں سے اس کا اظہار بھی کر چکا تھا۔ مگر میں نے ہمیشہ اسے ٹال دیا۔ یہ پورا معاملہ ہے سردار۔''

میں چرنجی کی صاف گوئی سے بہت خوش ہوا۔ جس نے خود اپنی اولاد کے بارے میں بغیر کوئی سفارش کئے نہایت صاف گوئی سے تمام بات بتا دی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''چرنجی! میں ابھی چلتا ہوں' میں تمہاری صاف گوئی اور سچائی سے بہت خوش ہوا۔'' یہ بات سن کر جھونپڑے کے اندر کی طرف سے بڑی ٹھکرائین نکل آئیں۔ اس وقت جھونپڑی کے اندر والے حصے ہی میں شوبھا دلہن بنی بیٹھی تھی اور اندر والا حصہ عورتوں اور لڑکیوں سے بھرا پڑا تھا۔

میں اور چرنجی گھوڑوں پر سوار بڑے میدان کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ میں جیسے ہی وہاں پہنچا۔ بڑے زور کا شور سا ہوا۔ میں چبوترے پر چڑھا جس پر شادی کا منڈپ بنا ہوا تھا اور ایک پنڈت بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر چبوترے سے نیچے اتر گیا۔ میں نے زوردار آواز میں کہنا شروع کیا۔

''میرے بہادر اور جان نثار ساتھیو! میں جانتا ہوں کہ تم سب کو مجھ سے

ے پناہ پیار ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ آپس میں میری وجہ سے لڑو۔ اس
ی کے موقع پر میں وادی والوں کو ایک اور بڑی خوشی کا پیغام دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے
اب ان کے ساتھیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی ہے اور آج سے وہ دوسو
ائی سو سے بڑھ کر ہزار کے قریب ہو چکے ہیں۔ مگر مجھے اس موقع پر آپ لوگوں کو
نصیحت کرنی ہے کہ ایک دوسرے کی وفاداری پر شک نہ کریں اور جو لوگ
رے گروہ میں نئے شامل ہوئے ہیں' ان سے محبت کا سلوک کریں' اس لئے کہ
وں نے بہت بڑی قربانی دی ہے' وادی والوں کے بیوی بچے تو خیر ان کے
تھ یہیں ہیں مگر ان بقیہ حضرات نے اس کی بھی پرواہ نہیں کی اور تمہارے سردار
وفاداری کا عہد کیا' ان کی وفاداریاں اور محبتیں اور غیر مشروط ہیں' اگر کوئی ان
سامنے مجھے برا بھلا کہے گا' یا میرے بارے میں کسی غلط بات کا اظہار کریگا تو یہ
کسی طرح اسے برداشت نہیں کریں گے اور تم لوگوں کو جو اس وادی کے قدیم
نے والے ہو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ان کی تعداد تم سے کتنی زیادہ ہے' اور تم
اس گھمنڈ میں بھی نہ رہنا کہ یہ لوگ نہتے ہیں۔ کل سے ان کی رائفلیں اور بقیہ
بھی انہیں دے دیا جائیگا۔ میں تمام جوانوں کو معاف کرتا ہوں جنہوں نے
ہی جذبات میں آ کر مجھے برا بھلا کہا اور سپاہیوں کے غصے کا شکار ہوئے اور میں
شامل ہونے والوں سے بھی کہتا ہوں کہ وہ غصہ تھوک کر ان لوگوں کو معاف
یں۔ مگر آئندہ سے ایسا کوئی ناخوش گوار واقعہ ہرگز نہیں ہونا چاہئے بس مجھے اور
ہیں کہنا۔''

اس کے بعد سارا میدان سردار رنجیت سنگھ کی جے سے گونج اٹھا۔ اب ان میں نئی آوازیں بھی شامل ہو چکی تھیں بڑے ٹھاکر میرے قریب آئے اور میری پیٹھ ٹھونک کر معاملے کو رفع دفع کرنے کی داد دی۔

''تمہارا لڑکا سنتا کہاں ہے چرنجی! اسے میرے پاس لاؤ اور سنو ذرا رام سروپ کو بھی میرے پاس بھیجو۔'' اس پر چرنجی غمزدہ سے لہجے میں بولا۔

''سردار! رام سروپ اپنے جوان بیٹے کی لاش اٹھا کر گھر لے گیا ہے۔ ہاں، میں سنتا کو دیکھتا ہوں'' یہ کہہ کر وہ مجمع میں سنتا کو تلاش کرنے آگے بڑھ گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد لوٹ کر آ کے بولا۔

''وہ خدا جانے وہ کدھر گیا؟'' ابھی جب میں آپ کو لینے جھونپڑے گیا تھا وہ یہیں بڑے ٹھاکر کی پناہ میں تھا۔ اس لئے کہ سپاہی اسے بھی مار ڈالنا چاہتے تھے۔ بڑے ٹھاکر سے معلوم کیجئے۔'' یہ سنتے ہی میں بڑے ٹھاکر کی طرف بڑھا دو قدم آگے کھڑے کسی باورچی کو کچھ ہدایات دے رہے تھے انہوں نے بتایا کہ سنتا میرے یہاں پہنچتے ہی اور اس اعلان کے بعد کہ میں نے ان تمام لوگوں کو معاف کر دیا ہے جنہوں نے مجھے برا بھلا کہا تھا، یہاں سے چلا گیا تھا، خیر میں خاموش ہو گیا۔ میرا کچھ اور ہی مقصد تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ لگے ہاتھوں یہ کانٹا بھی نکل جائے میرا ارادہ تھا کہ سنتا کو کہیں تنہائی میں لے جا کر اس کے ذہن کو اپنے قابو میں کر کے اس کے دل سے شوبھا کا خیال قطعی نکال دوں۔ مگر سنتا یہاں موجود ہی نہیں تھا۔

میں ابھی ان ہی خیالوں میں تھا کہ بڑے ٹھاکر بولے۔'' دیکھو سورج ب ہو گیا اور ابھی تک شادی کی رسوم شروع ہی نہیں ہوئیں۔ چلو! جلدی سے ر چلو تمہیں سہرا بھی تو باندھنا ہے، پھر یہیں اسی میدان میں برات آئے گی۔'' سرور لہجے میں بولے اور میں چند لوگوں کے ہمراہ جنہیں میرے ساتھ برات پھر یہیں واپس آنا تھا دوبارہ جھونپڑے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان لوگوں میں ں، گرنام سنگھ، رحمان اور ڈیسوزا وغیرہ بھی شامل تھے۔ یہ قافلہ جیسے ہی اس گلی داخل ہوا جس میں ہمارا جھونپڑا تھا ہم نے عورتوں کی چیخ و پکار سنی گرنام سنگھ گھوڑا تیز دوڑانا ہی چاہتا تھا کہ اس سے پہلے چرنجی اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر ایک ی ہوئی عورت کے قریب پہنچ گیا۔ یہ بڑی ٹھکرائین تھیں جو زار زار رو رہی تھیں نہیں ہم دوری کے سبب نہیں پہچان پائے تھے، ان کے ساتھ اور دوسری عورتیں بین کر رہی تھیں۔ نہ معلوم بڑی ٹھکرائین نے روتے ہوئے چرنجی سے کیا کہا وہ فوراً گھوڑے پر بیٹھ کر سامنے گلی میں دوڑتا چلا گیا اور گلی کے موڑ پر جا کر ب ہو گیا۔ اب ہم عورتوں تک پہنچ گئے بڑی ٹھکرائین مجھے دیکھتے ہی بڑے زور چیخ مار کر بے ہوش ہو گئیں۔ میں چکرا گیا۔

بڑے ٹھاکر آخر کار گرجے'' معاملہ کیا ہے آخر؟ اور مجھے بھی کچھ ہوش ۔ جو پتا چلا کہ یہ معاملہ ہے تو میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ سنتا ں کا لڑکا زبردستی شوبھا کو اٹھا لے گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی سمجھ پاتا اور کچھ ہ کرتا۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس سمت دوڑنے لگا جس سمت چرنجی گیا

تھا' یہ راستہ گلی کے ختم ہوتے ہی اس طرف نکل جاتا تھا جہاں سے غار نما سرنگ
شروع ہوتی تھی جو اس وقت تباہ ہو چکی تھی۔ چرنجی کا خیال صحیح تھا۔ میرے پیچھے ایک
گھوڑا اور دوڑا یہ گرنام سنگھ کا تھا اس کے پیچھے ہی رحمان نے بھی گھوڑے کو ایڑ
لگائی۔

اب ہم تینوں آگے پیچھے اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے غار نما
سرنگ تک پہنچ گئے جو اب قطعی تباہ ہو چکی تھی۔ ہم ابھی کچھ دور ہی چلے ہوں گے کہ
ہم نے ایک عجیب منظر دیکھا۔

ہم نے اپنے گھوڑوں کی باگیں کھینچ لیں سنتا ایک ہاتھ سے گھوڑے پر بیٹھی
ہوئی شوبھا کو پکڑے ہوئے تھا' جیسے عقاب اپنے شکار کو دبوچتا ہے۔ اس کے
دانتوں میں گھوڑے کی باگ دبی ہوئی تھی۔ اور سیدھے ہاتھ میں بندوق تھی اور اس
سے کچھ فاصلے پر چرنجی اس کا راستہ روکے بندوق تانے گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ سنتا
کہہ رہا تھا۔

''مجھے جانے دے بابا! میرا راستہ کھوٹا نہ کر' کہیں میرے ہاتھ تیرے خون
سے نہ رنگ جائیں۔ ہٹ جا میرے سامنے سے۔'' یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ
لگائی۔

چرنجی چیخا۔ ''سنتا...... رک جا سنتا...... ورنہ...... ورنہ...... سنتا...... سن
تا......'' اور ایک فائر کی آواز سنائی دی چرنجی نے سنتا کو گولی ماردی تھی گولی اس کی
پیٹھ پر لگی اور وہ پیٹھ ہی کے بل تڑپ کر گھوڑے سے گرا ہم سب بھی اب چرنجی کے

ریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے اس کی بندوق چھین لی۔

وہ خودکشی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ میرے اس جملے پر رو پڑا۔

''مجھے مرجانے دو سردار مجھے مرجانے دو...... میرا یہی ایک بیٹا تھا جسے
ں نے آج خود اپنے ہاتھ سے گولی ماردی۔ اب میں کس کے لئے جیوں؟''

میں نے اسے دلاسا دیا اور وہ سسکیاں بھرتا ہوا اٹھا' اٹھ کر وہ سنتا قریب
یا جس میں ابھی کچھ سانسیں باقی تھیں۔ چرنجی نے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر
ینے سے لگا لیا اس کے منہ سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ چرنجی میرے پاس آیا اور سنتا کو
رے قدموں پر ڈال دیا۔ وہ یقیناً مرنے والا تھا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ آواز بہت
ہی تھی میں نے جھک کر سنا وہ کہہ رہا تھا۔

''شوبھا...... شو...... او...... بھا......' اور پھر ایک مرتبہ تڑپ کر ٹھنڈا
گیا۔ شوبھا کے لئے یہ دوسری قربانی تھی چرنجی کی عظمت کا میں قائل ہو گیا۔ شوبھا
ے لئے یہ دوسری قربانی تھی چرنجی کی عظمت کا میں قائل ہو گیا۔ چرنجی جس نے
ہ پر اپنی اولاد کو قربان کر دیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا اور وہ
وٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

یہ بھی عجیب دن تھا کہ ختم ہوتے ہوئے ایک اور ہنگامے کو جنم دے گیا
ب ہم نے مڑ کر دیکھا تو اور بہت سے لوگ اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے ہم سے
یب ہوتے جا رہے تھے۔ یہ بڑے ٹھاکر اور وادی کے دوسرے لوگ تھے۔ سنتا
ی لاش ایک گھوڑے پر وادی میں واپس لائی گئی۔ شوبھا جو اس وقت خاصی سہمی

ہوئی اور ایک دم بجھی بجھی سی لگ رہی تھی۔ بڑے ٹھاکر کے گھوڑے پر بیٹھ کر وادی کی طرف روانہ ہوگئی اور ہم سب بھی۔ اتنی ساری ہنگامہ خیزیوں نے مجھ کو تھکا دیا تھا اور میرا جسم دکھنے لگا تھا۔ مگر ابھی تو شادی کی رسوم باقی تھیں۔ ہم سب لوگ بڑے جھونپڑے پہنچے اور تھوڑی دیر بعد برات وہاں سے روانہ ہوکر بڑے میدان میں پہنچ گئی۔ پنڈت نے اشلوک پڑھے۔

''اوم......اوم...... اوم اس سواہا۔'' اور شوبھا کی ساری کا دامن میرے کرتے کے ساتھ باندھ کر منڈپ کے پھیرے کرائے گئے۔ شادی کی رسومات پوری ہونے کے بعد سب سے پہلے مجھے مبارکباد دینے والوں میں چرنجی، کرنام سنگھ اور رام سروپ ہی تھے۔ جن کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ میں نے ان تینوں کو باری باری گلے سے لگایا اور اس سے پہلے کہ میں شادی کی خوشی میں ان کے دکھ کو بھول جاتا اور کھانا وغیرہ کھاتا۔ میں چرنجی اور رام سروپ جن کے گھر برابر تھے ان کے ساتھ تعزیت کے لئے گیا جہاں ان دونوں کے جوان بیٹوں کی ارتھیاں سجی رکھی تھیں اور ان کے کریا کرم سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنے جھونپڑے میں قدم رکھا رات بھر بڑے میدان میں شادی کا جشن منایا جاتا رہا۔ کھانا کھلایا گیا۔ رقص و سرور کی محفلیں گرم ہوئیں۔ مگر میں اور شوبھا سب کو چھوڑ کر اپنے جھونپڑے میں آ گئے۔



صبح جب میں نہا دھو کر فارغ ہوا تو گرنام سنگھ آ گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ بولا ''سردار آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے تمام لوگوں کو جھونپڑوں کی تعمیر پر لگا دیا ہے اور اس کے بعد غار نما سرنگ کی مرمت اور تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے گا مگر ایک بات میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ پہلے آدمی کم تھے ہمارا خرچا بھی کم تھا اب ایک دم اتنے آدمی بڑھنے سے اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں''۔

میں نے کہا ''تو پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟۔''

وہ بولا۔ ''میرا کیا ارادہ سردار آپ اچھی طرح اور مجھ سے بہتر سب کچھ جانتے ہیں''۔

میں نے کہا ''پھر بھی''۔

میری ناچیز رائے یہ ہے کہ نواب داؤد خان کے گاؤں پر حملہ کیا جائے پچھلی مرتبہ ہمارا ڈاکا پولیس کی بروقت آمد سے ناکام ہو گیا اور اس مرتبہ مخبری کی

وجہ سے راستے ہی میں ہمیں پولیس سے نمٹنا پڑ گیا اور ہم وہاں تک نہ پہنچ سکے۔ کیا خیال ہے اگر پھر ایک مرتبہ وہیں ڈاکا پڑے۔'' بڑے ٹھاکر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''بہت نیک خیال ہے بیٹے۔ اس ظالم کے پاس بڑی دولت ہے' سنا ہے اس نے اپنے کسانوں کا خون چوس چوس کر تجوریاں بھر لی ہیں اور اسے اپنے پرکھوں سے بھی خاصی دولت ہاتھ لگی ہے۔ کیونکہ اس کے پرکھے بھی اسی کی طرح کسانوں کا خون چوسنے میں ماہر تھے۔''

یہ بات آخر کار طے ہو گئی کہ ڈاکا مہرول پر ہی پڑے گا اس گاؤں کے نواب کا نام داؤد خان تھا۔ میں نے ایک تجویز پیش کرنا چاہی جس پر گرنام سنگھ بولا ''سردار! اگر کوئی منصوبہ بنانے کا خیال ہے اس ڈکیتی کے بارے میں تو میری ناچیز رائے یہ ہے کہ رام سروپ چرنجی اور دوسرے اہم لوگوں کو بھی کیوں نہ یہیں بلا کر رائے مشورہ کیا جائے۔'' میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے مگر زیادہ بھیڑ کی ضرورت نہیں۔ صرف تم چرنجی' رام سروپ اور ڈسوزا کو بلا لاؤ۔'' تھوڑی ہی دیر میں یہ سب لوگ جمع ہو گئے اور میں نے اپنی تجویز ان کے سامنے رکھی جسے سب ہی نے پسند کیا اور یہ تجویز تھی بھی بہت بے ضرر' میری تجویز یہ تھی کہ نواب داؤد خان کو پہلے ایک خط لکھا جائے جس کا مضمون کچھ ایسا ہو کہ تم پچھلی مرتبہ ہم سے بچ گئے مگر اس مرتبہ ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ ہم تمہاری جان کے نہیں دولت کے دشمن ہیں۔ وہ دولت جو تم نے غریبوں کا خون چوس چوس کر جمع کی ہے اگر تم نے پولیس کو اس کی اطلاع دی تو تمہاری جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ڈاکا کامیاب ہو نہ ہو

ہم تمہیں ضرور ٹھکانے لگا دیں گے میری تجویز میں رام سروپ نے یہ کہہ کر اضافہ کیا کہ ''یہ خط داؤد خان تک شنکر لال پہنچائے گا۔ اس لئے کہ وہ بہت دور سے خنجر پھینکنے میں ماہر ہے۔ ایسا اس لئے ضروری ہے کہ نواب پہلے ہی سے خوفزدہ ہو جائے خط خنجر میں پرو کر اندر اس کے محل نما گھر میں پھینکا جائے۔'' سب نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ اس کے بعد میں نے پھر کہنا شروع کیا'' ہاں تو جب شنکر خط پھینک کر تقریباً ایک میل واپس آ چکا ہو۔ وہاں پولیس پہنچ جائے۔''

سب بولے۔'' کیا مطلب ہے۔؟''

میں نے کہا۔'' مطلب یہ کہ مہراول گاؤں سے ایک میل ادھر پہلے ہی سے ہمارے آدمی پولیس کی وردیوں میں ملبوس موجود ہوں جن کی سربراہی رحمان کر رہا ہو۔ اور...... میری بات کاٹ کر بڑے ٹھاکر بولے۔'' کیا رنجیت تو نہیں جائے گا۔ اس ڈاکے پر۔؟''

میں نے فوراً کہا کہ میں بھی ضرور ہوں گا اور اصل سربراہی میں ہی کروں گا مگر دکھاوے کے لئے رحمان ہمارا بڑا افسر ہوگا اس لئے کہ......'' میں نے ذرا آہستہ سے جھک کر بڑے ٹھاکر کے کان میں کہا۔ گرنام اور چرنجی نے جو میرے قریب ہی بیٹھے تھے میرا جملہ سن لیا اور سر ہلانے لگے۔'' بابا! یہ اس لئے کہ رحمان پولیس کا آئی جی رہ چکا ہے اور اسے تمام بڑے بڑے نواب جاگیردار اور راجے پہچانتے ہیں۔'' بڑے ٹھاکر زور سے چونکے گیا؟ (رحمان آئی جی؟ میں نے پھر آہستہ سے کہا۔ ہاں'' اس لئے کہ یہیں رحمان اور ڈوسزا بھی موجود تھے اور میں نہیں چاہتا

تھا کہ ان کے سامنے ان کی پچھلی زندگی کا کوئی واقعہ دہراؤں اور ان کے ذہن کو اس طرح شاک پہنچاؤں۔ ہوں تو پھر؟ تم کیا کہہ رہے تھے۔؟ میں نے پھر کہنا شروع کیا۔

'' ہاں تو میں اور تقریباً میرے دو سو آدمی پولیس کی وردیوں میں ملبوس مہراول سے ایک میل ادھر ٹھہرے رہیں گے جب شنکر خنجر پھینک کر ہم تک واپس آ چکا ہوگا۔ ہم مہراول کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ شنکر یہاں سے پولیس ہی کی وردی میں روانہ ہوگا تا کہ ہمارے ساتھ پھر مہراول چل سکے۔ ہم لوگ نواب داؤد خان کے محل نما گھر میں داخل ہوں گے پولیس کی حیثیت سے اور اس سے یہ کہیں گے کہ ہماری اطلاع کے مطابق آج رات ہی یہاں مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ ڈاکا ڈالنے والا ہے اور اس نے تمہیں کوئی خط بھی روانہ کیا ہے ہم سے کچھ مت چھپاؤ۔ سب کچھ بتا دو پولیس تمہاری پوری مدد کرے گی لیکن ہو سکتا ہے کہ مقابلہ سخت ہو اس لئے تم اپنی ساری دولت اور زیورات وغیرہ ہمیں دے دو تا کہ ہم اسے لے کر یہاں سے پہلے ہی روانہ ہو جائیں اور سرکاری خزانے میں تمام روپیہ جمع کرا دیں۔ بعد میں یہ رقم اور زیورات تمہیں واپس مل جائیں گے۔ یہ تمام باتیں اس سے رحمان کہے گا اور اپنے آپ کو پولیس کا آئی جی بتائے گا۔ اور کہے گا کہ اس وقت ہم یہ رقم اور زیورات لے جا رہے ہیں اور تھوڑی دیر بعد ہی آ کر پورے گاؤں کو خفیہ طور پر گھیر لیں گے تا کہ جب ڈاکو داخل ہوں تو ہم انہیں زندہ گرفتار کر لیں۔ اس کے بعد ہم سب چپ چاپ جیپ اور سڑکوں میں بیٹھ کر بغیر کسی

خطرے کے واپس یہیں آ جائیں گے۔

میری یہ تجویز سب کو بہت پسند آئی اور اس لئے بھی کہ اس طرح ایک تو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی کہ نواب کو مار پیٹ کی تجوریوں کا پتا اور چابی وغیرہ حاصل کی جائے۔ دوسرے لڑائی بھڑائی کی بھی اس میں کوئی ضرورت بظاہر نہیں تھی اور کوئی ناکامی کی صورت بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ پہلی صورت میں اس کا امکان تھا کہ لالچی نواب جان دے دیتا مگر تجوریوں کا پتہ نہ بتاتا جنہیں ڈھونڈنا مشکل ہوتا۔ دوسرے گاؤں والوں سے مقابلہ۔ اس تجویز میں ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

تمام لوگوں نے مل کر طے یہ کیا کہ یہ کام آج ہی ہونا چاہئے آج شام ہی چار بجے کے قریب سب کو روانہ ہو جانا چاہئے تا کہ دن ڈھلے تک مہراولی پہنچا جاسکے شنکر کے لئے بھی یہی طے ہوا تھا کہ وہ بھی ہمارے ہی ساتھ ساتھ یہاں سے چلے گا۔ شام ہوتے ہوتے تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ ہمیں یہاں سے ٹرکوں اور جیپ پر جانا تھا۔ ایک سدھا ہوا گھوڑا بھی ایک ٹرک میں سوار کرا لیا گیا تا کہ مہراولی سے ایک میل ادھر شنکر اس پر چڑھ کر مہراولی جاسکے اور خنجر کے ساتھ خط پھینک کر واپس آسکے آدھے آدمی میں نے بالکل نئے لئے یعنی پولیس والے اور آدھے وادی کے پہلے رہنے والوں میں سے۔ جیپ' میں' میں خود رحمان' ڈسوزا' گرنام سنگھ' رام سروپ اور چرنجی سوار ہوئے۔ ہم چھ آدمی جیپ میں تھے۔ جیپ دسوزا چلا رہا تھا اس کے برابر گرنام سنگھ بیٹھا تھا اور پچھلی سیٹوں پر ہم بقیہ لوگ' رحمان

ہم سب پولیس کی وردیوں میں تھے۔ آگے آگے جیپ تھی اس کے پیچھے چار
وں پر بقیہ لوگ تھے۔ جو سب کے سب پولیس کی وردیوں میں ملبوس تھے۔ ان
وں کو بھی پولیس کے تجربے کار ڈرائیور چلا رہے تھے۔ یہ معلوم کر لیا گیا تھا کہ ان
ڈرائیو کون کر سکتا ہے۔

وادی کے سو آدمیوں کے کپڑے پولیس والوں کی وردیوں سے تبدیل
ادیئے گئے تھے۔ یہ سب بہادر جوان تھے۔ ہم سب کے پاس رائفلیں اور
الور وغیرہ تھے جو پولیس ہی سے ہمیں ملے تھے۔ راستہ کیوں کہ اونچا نیچا اور
ار گزار تھا اس لئے ہمیں مہراولی سے ایک میل ادھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی اب
ج غروب ہو رہا تھا۔ چاروں ٹرک اور جیپ روک دیئے گئے۔ ایک ٹرک سے
ڑے کو اتارا گیا جس پر بیٹھ کر شنکر مہراولی کی طرف روانہ ہوا اور تقریباً آدھے
ے میں واپس بھی آ گیا۔ وہ اپنا کام بحسن وخوبی پورا کر چکا تھا۔ اب دن پوری
ح ڈھل چکا تھا ہم لوگوں کا سفر دوبارہ شروع ہوا ہم بے دھڑک گاؤں میں گھس
ۓ۔ گاؤں والے اتنے سارے پولیس والوں کو دیکھ کر سہم گئے۔ ہم نواب کی
لی کی طرف بڑھ رہے تھے نواب کو بھی شاید کسی نے دوڑ کر خبر کر دی وہ حویلی کے
ازے پر ہمارا استقبال کرنے کے لئے موجود تھا جیسے ہی ہماری جیپ اس کے
ازے پر آ کر لگی وہ دوڑ کر آیا اور بولا آئی جی صاحب! ارے ڈسوزا صاحب بھی
ود ہیں۔ آداب! آداب میری یہ قسمت کہ آپ لوگ خود غریب خانے پر
یف لائیں۔ آیئے آیئے دیوان خانے میں آ جایئے۔

ہم سب لوگ اتر کر حویلی میں داخل ہوئے حویلی پکی بنی ہوئی تھی ہم صرف چھ اشخاص اس کے ساتھ اندر گئے باقی لوگ ٹرکوں ہی میں بیٹھے رہے۔اندر پہنچ کر ہمیں اس شخص نے قالینوں پر بیٹھایا اب میں نے نواب کا جائزہ لینا شروع کیا وہ تقریباً 45 سال کا ایک صحت مند شخص تھا اس کی شخصیت میں مجھے سب سے عجیب اس کی مونچھیں اور آنکھیں لگیں۔اندر دھنسی ہوئی لال لال چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور یہ بڑی بڑی مونچھیں جو کئی بل کھا کر اس کے آدھے رخساروں کو گھیرے ہوئے تھیں اگر اس کی مونچھوں کے دونوں سروں پر لیمو رکھ دیئے جاتے تو شاید ہی گرتے وہ شخص ہم سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آرہا تھا مگر اس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار صاف پڑھے جا سکتے ہیں۔

خط یقیناً اس تک پہنچ چکا ہوگا اور وہ بھی بدنام زمانہ اور سفاک ڈاکو رنجیت سنگھ کا خط جس کا نام سن کر ہی اچھے اچھوں کے ہوش ٹھکانے آجاتے تھے۔مگر اس نے ہم سے اس خط کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔اور ہم بیٹھے ہوئے اس سے ادھر ادھر کی گپ بازی کرتے رہے وہ اپنے شکار کے قصے سنانے لگا تھا۔آخر کار میرا اشارہ پا کر رحمان نے لب کشائی کی۔''دراصل ہم اس لئے حاضر ہوئے ہیں نواب صاحب کہ ہمیں باخبر ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ آج یہاں مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ ڈاکا ڈالنے والا ہے اور اس نے اب تک آپ کو خط بھی پہنچا دیا ہوگا اس کا خط آپ تک پہنچنے والا ہوگا۔آپ یہ بتایئے کہ کیا آپ کو کوئی خط ملا۔؟''

رحمان کی بات سنکر نواب کچھ ہچکچایا اور بولا۔''نہیں آئی جی صاحب آپ

کو شاید غلط اطلاع......''

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔''نواب صاحب! ہمیں غلط اطلاع نہیں ملی۔ڈریئے مت پولیس آپ کے ساتھ ہے پہلے بھی ایک موقع پر پولیس آپ کو اس ڈاکو سے بچا چکی ہے۔صاب صاف سب کچھ بتا دیجئے اسی میں آپ کی بہتری ہے۔قانون کے ہاتھ مضبوط کرنا ویسے بھی آپ کا فرض ہے ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں رنجیت سنگھ آپ کا کچھ نہ بگاڑ پائے گا۔ہمارے جوان ساری رات یہیں آپ کی حفاظت پر رہیں گے۔''

میری بات سنکر نواب چالاکی سے بولا۔''یہ بہت اچھا ہے کہ رات بھر آپ کے جوان یہاں رہیں۔اب تک تو مجھے اس حرام خور کا کوئی خط نہیں ملا۔کیا پتا وہ آہی جائے۔اس لئے یہی اچھا ہے کہ پولیس یہیں رہے۔''اس کی عیاری کا جواب اس مرتبہ ڈسوزا نے دیا اس لئے کہ اس سرشت ہی میں عیاری تھی۔وہ بولا'' ویل نباب! ام چلتا ہے اور پولیس کو بھی ادر سے لے جاتا ہے۔ام بیکار نہیں جو بکیار آپ کا پیرا دے گا۔جب تم کو کھت ملا نہیں تو کیوں ڈرتا ہے۔''یہ کہہ کر ڈسوزا اٹھنے کے لئے تیار ہونے لگا۔

''سنئے تو ڈی آئی جی صاحب! آپ تو ناراض ہوگئے۔میرا مطلب یہ نہیں تھا بلکہ......''ڈسوزا پھر بات کاٹ کر بولا۔''ویل پھر تم سچ بولو۔''میں تو سچ ہی۔لہٰذا تو بول دوں مگر......''اس مرتبہ اس کی بات رحمان نے کاٹی۔''ہمیں معلوم ہے کہ اس ڈاکو کے بچے نے تمہیں لکھا ہوگا کہ اگر پولیس کو اطلاع دی تو تمہیں جان

سے مار دے گا۔ مگر تم اس کی اس دھمکی میں مت آؤ۔ اور وہ خط ہمیں فوراً لاکر دکھاؤ۔

ہم ہر طرح تمہاری جان و مال کی حفاظت کریں گے۔ یہ ہمارا فرض ہے۔'' آخر کار نواب کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے اور اس نے ہمارا ہی بھیجا ہوا خط اور خنجر ہمیں لاکر دکھایا۔ ہم نے اسے تسلی دی۔ اور پھر رحمان نے اپنی تجویز رکھ دی یعنی نواب تمام دولت پولیس کے حوالے کر دے تاکہ سرکاری خزانے میں حفاظت کے ساتھ اسے رکھا جا سکے۔ اس تجویز پر نواب نے پھر چکر دینے کی کوشش کی مگر ہم لوگ تو طے ہی کر کے گئے تھے کہ اسے نکلنے نہیں دیں گے آخر کار وہ ہمیں ساتھ لے کر اندر حویلی میں گیا۔ ہم نے اپنے کچھ آدمی باہر سے اور بلوا لئے تاکہ سامان بحفاظت باہر ٹرکوں میں رکھا جا سکے۔ نواب داؤد کی تجوریاں کیا تھیں۔ عمر عیار کی زنبیلیں تھیں۔ کوئی چھ تجوریاں تھیں جو نوٹوں' ہیروں اور جواہرات سے بھری ہوئی تھیں۔ بمشکل تمام انہیں ہمارے آدمیوں نے خالی کیا۔ جب تمام تجوریاں خالی ہو چکیں تو نواب ہم سے بولا کہ ''مجھے بھی آپ لوگ ساتھ لیتے چلیں۔'' ہم نے کہا'' چونکہ ہمیں ابھی شہر پہنچنا ہے اور راستہ خطرناک ہے اس لئے ہم یہ نہیں چاہتے کہ نواب صاحب قبلہ کی جان خطرے میں پڑے کیونکہ جب ڈاکو رنجیت سنگھ نے انہیں خط لکھنے کی ہمت کی ہے تو پولیس سے بھی خزانہ لوٹنے کی جرات کر سکتا ہے اس لئے تمام سپاہیوں کا واپس جانا اس خزانے کے ساتھ ضروری ہے۔ خزانہ پہنچا کر یہ لوگ اور ہم سب فوراً ہی واپس آ جائیں گے۔'' ہمارے اس طرح سمجھانے اور

ے دینے سے نواب داؤد کو کچھ اطمینان ہوا اور اس نے ہمیں گلے مل مل کر ت کیا۔

ہم سب جیپ اور ٹرکوں کے ساتھ روانہ ہو گئے اور گاؤں والوں کو کانوں ن خبر نہیں ہوئی کہ ہم پولیس والے نہیں بلکہ ڈاکو ہیں ہم انہیں کے سامنے سے گزر ۔ جب ہم گول وادی تک پہنچے خاصی رات ہو چکی تھی رات کے تقریباً 9 بجے کا ل تھا۔ ہماری جیپ اور وہ ٹرک جس میں نوٹ اور جواہرات تھے بڑے جھونپڑے سامنے آ کر رک گئے اور ان میں سے نوٹ جو جلدی جلدی میں نواب نے ے بڑے چھ بوروں میں بھروا دیئے تھے اتارے گئے اس کے بعد ہیرے رات اور سونے چاندی سے بھرے ہوئے تینوں صندوق اتارے گئے۔ اتنا ڈاکا شاید بڑے ٹھاکر نے اپنی پوری زندگی میں نہیں ڈالا تھا۔ وہ نوٹ اور سونا ہ دیکھ کر حیران رہ گئے اور بہت دیر تک میری تجویز کی داد دیتے رہے۔

دوسری صبح یہ تمام دولت زیورات اور سونا خود بڑے ٹھاکر نے تمام لوگوں تسیم کر دیا۔ یہ تمام سامان تقریباً ایک ہزار آدمیوں میں بٹنے کے باوجود ہر آدمی کے حصے میں اتنا آیا تھا کہ انہوں نے زندگی بھر اتنی دولت کا تصور نہیں کیا تھا۔ اس دولت میں سے ایک حصہ وادی کے لوگوں کی مجموعی فلاح و بہبود کے لئے اور خراجات کے لئے الگ رکھ دیا اور اس خوشی میں رات جشن کا اہتمام کیا گیا۔

جشن کیا تھا اچھا خاصہ طوفان بدتمیزی تھا۔ لوگ خوب ڈھیروں ڈھیر ۔ پی کر ناچ رہے تھے اور بڑا میدان مشعلوں کی روشنی سے جگمگا رہا تھا ایسا

محسوس ہوتا تھا جیسے سینکڑوں خوش فکرے ایک جگہ اکٹھا کر دیئے گئے ہوں۔ میں کل
کی طرح آج بھی گہما گہمی سے جلد ہی اکتا گیا اور شوبھا کو لیکر کل کی طرح بڑے
جھونپڑے روانہ ہوگیا اور کل سونے کی کسر بھی ہم دونوں نے آج پوری کی۔ ہم اس
وقت تک جاگتے رہے جب تک کہ دونوں ہی نڈھال نہ ہوگئے۔

صبح و شام اسی طرح گزرتے رہے۔ میں اس ماحول کا عادی ہوگیا تھا
میں اب رحمان سے پڑھنا لکھنا بھی سیکھ چکا تھا اور اچھی طرح موٹر چلانا بھی مجھے
آ گیا تھا۔ اور وادی کے دوسرے لوگ بھی سپاہیوں میں گھل مل گئے تھے اور ان سے
بہت سوں نے پڑھنا لکھنا اور ٹرک چلانا سیکھ لیا تھا۔ نئے جھونپڑے تعمیر ہو چکے
تھے اور غار نما سرنگ بھی دوبارہ بن چکی تھی۔ اب اسے پہلے سے زیادہ محفوظ او
کشادہ بنا دیا گیا تھا۔ اس عرصے میں ہمیں باہر کی خبریں بھی ملنے لگی تھیں اور ہمار
پاس باہر کے اخبار بھی آنے لگے تھے جن میں ہم دیکھتے کہ اکور نجیت سنگھ کے بار
میں کبھی کبھی عجیب عجیب خبریں چھپی ہوتیں۔ حکومت آئی جی رحمان اور ڈی آئی
ڈسوزا اور ان کے ساتھ سپاہیوں کی بھی تلاش میں تھی۔ حکومت نے نواب دا
خان کی بات پر یقین نہیں کیا تھا کہ خود آئی جی رحمان اس کی دولت اور جواہرات ا
لے گیا اس لئے کہ اس کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ گاؤں والوں نے صرف
اتنی گواہی دی تھی کہ انہوں نے پولیس کو گاؤں میں آتے اور واپس جاتے ضرو
دیکھا تھا۔ ادھر آئی جی رحمان وغیرہ کی گمشدگی کے متعلق طرح طرح کی قیا
آرائیاں ہو رہی تھیں ان کی تصویریں بھی کئی بار اخبارات میں شائع ہو چکی تھیں

ہیں دیکھ کر خود آئی جی رحمان اور ڈسوزا اور حیرت میں رہ گئے تھے کہ "لو انہوں
نے تو ہمیں سچ مچ کا آئی جی اور ڈی آئی جی بنا دیا" وہ اس بات پر گھنٹوں ہنستے
ہے اور میں بھی ان کی ہنسی میں بے دلی کے ساتھ شریک ہوتا اس لئے کہ میں ہی
راز سے آگاہ تھا کہ وہ واقعی "سچ مچ" کے آئی جی اور ڈی آئی جی ہیں دو تین
میاب ڈاکے ہم نے اور ڈالے اور ان میں بھی ایسی ذہانت کا ثبوت دیا کہ
س کو ہماری گرد بھی نہ ملی اس سے ہمارے حوصلے بھی اب پہلے سے بڑھ گئے
۔ اب ہم باقاعدہ چیلنج کر کے ڈاکے مارتے تھے اور جہاں بھی ہمارا خنجر اور خط
جاتا تھا ہم وہاں سے ناکام واپس نہیں آتے تھے۔ ان میں سے کسی جاگیردار یا
بندار کی یہ جرات نہیں ہوتی تھی کہ پولیس کو مطلع کرے۔ اب میرے ساتھ بھی
ھار تفریحاً شوبھا بھی ڈاکوؤں میں شامل ہو جاتی تھی۔

ہمارے ٹھکانے سے کوئی ستر میل دور ایک رجواڑا تھا۔ جس پر گرنام سنگھ
نظر تھی اس کے راجہ کا نام شمشیر سنگھ تھا جو بہت جابر اور ظالم مشہور تھا۔ آج تک
پر کسی نے ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ دوسرے اس کی لڑکی راجکماری شانتی پر اپنا یار
نام سنگھ مرمٹا تھا اسے بھی اٹھا کر لانا تھا۔ ہماری شہرت یقیناً راجہ شمشیر سنگھ تک پہنچ
تھی ہم نے حسب معمول اسے دھمکی آمیز خط روانہ کر دیا۔ مگر اس مرتبہ اندازہ
نکلا ہم جیسے ہی سیتا پور کی حدود میں داخل ہوئے ہم پر جہنم کے دہانے کھل گئے
کے لئے ہم قطعی تیار نہیں تھے۔ میں گھبرا گیا اس لئے کہ بدقسمتی سے اس
کے میں شوبھا بھی میرے ساتھ تھی مجھے اپنی کوئی فکر نہیں تھی۔ ہاں شوبھا کے

لئے میں فکر مند ہو گیا۔ گرنام سنگھ آج اور ہی جوش میں تھا۔ مقابلہ سخت تھا ہمیں
پیش قدمی میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ راجہ نے یقیناً پولیس کو ہمارا خط پہنچا دیا
تھا۔ ہم ابھی اس کے قلعہ نما مکان سے خاصی دور تھے۔ پورا قصبہ فائرنگ سے گونج
اٹھا۔ پولیس بھی غالباً خاصی تعداد میں تھی میں نے جب محسوس کیا کہ ہم پسپا ہونا
شروع ہو گئے ہیں تو گھبرا گیا۔ قریب ڈسوزا ایک ٹوٹے ہوئے مکان کی دیوار کی آڑ
لئے فائرنگ کر رہا تھا۔ اس نے میری پریشانی کو بھانپ کر کہا۔ ''ویل سردار کاہے
گھبراتا ہے ابھی ہمارے پاس بوہت امونیشن ہے۔ اور ام ابی آرڈر کرتا کریٹ
پھینکو کریٹ۔'' ڈسوزا کی اس رائے سے میں نے اتفاق کیا۔ ہم پوری تیاری سے
چلے تھے اور ہمارے پاس خاصی تعداد میں دستی بم موجود تھے۔ میرے حکم پر دستی بم
بھی پھینکے جانے لگے پولیس والے شاید اس کے لئے تیار نہیں تھے ان کے ذہن
میں دور تک یہ نہیں تھا کہ ہمارے پاس دستی بم بھی ہوں گے۔ دھماکے پر دھماکے
ہونے لگے اور قصبے کے چھوٹے کچے پکے مکان گرنے لگے جن میں سپاہی
بھاری تعداد میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ بری طرح پسپا ہو رہے تھے ہم راجا کے قلعہ نما
مکان تک پہنچ گئے۔ لاشیں ہی لاشیں چاروں طرف بکھری پڑی تھیں۔

قصبے والے شاید خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور جو پولیس کے
بچے کھچے جوان رہ گئے تھے وہ بھی جان بچانے کی فکر میں تھے۔ اچانک میری نظر
سامنے راجا کے مکان پر پڑی اور ایک جھروکے سے میں نے راجا کی ایک جھلک
دیکھ لی ایک ہی لمحے میں اس کی بندوق کی نالی اس جھروکے میں نظر آئی اور ایک فائر

ہوا۔ میرے برابر ہی ایک چیخ سنائی دی یہ شوبھا تھی گولی عین اس کی کنپٹی پر لگی تھی
وہ گھوڑے سے گری اور گرتے ہی دم توڑ دیا۔ میں یہ دیکھ کر اپنے گھوڑے سے
کودا اتنی دیر میں گولیوں کی ایک پوری باڑھ جھروکے پر پڑی اور اس کے بعد ہی
ایک دستی بم پڑا۔ بڑے زور کا دھماکا ہوا اور اس قلعہ نما مکان کا اگلا حصہ دھڑام سے
نیچے آرہا مگر میں ان سب سے بے خبر شوبھا کے مردہ جسم کو اپنی آغوش میں
سمیٹے بیٹھا تھا۔ گم سم سا۔ فائرنگ اب قطعی بند ہو چکی تھی غالباً پولیس پسپا ہو کر فرار
ہو چکی تھی۔ اچانک میرے کاندھے پکڑ کر کسی نے مجھے ہلایا۔ ’سردار کیا ہوا آپ کو؟
رے شوبھا رانی! انہیں کیا ہوا۔'' یہ رحمان تھا۔

میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''شوبھا! اب کبھی واپس نہیں آئے
گی۔ وہ چلی گئی رحمان! مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔'' یہ کہتے کہتے میرا دل ایک دم
بھر آیا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ شوبھا کی لاش میرے سینے سے لگی ہوئی
تھی۔ مجھے اس وقت قطعی اس بات کی فکر نہیں تھی کہ راجہ شمشیر سنگھ کی دولت ہمیں ملے
گی یا نہیں اور یہ کہ گرنام سنگھ کی محبوبہ راجکماری شانتی زندہ بچی ہو گی کہ نہیں۔

انہیں نے مجھے شوبھا کی لاش کے ساتھ جیپ تک پہنچا دیا۔ راجا شمشیر سنگھ
مارا جا چکا تھا اور اس کا قلعہ فتح ہو چکا تھا۔ اسے اس کی بڑی پگڑی اور انگلیوں
میں پڑی ہوئی قیمتی انگوٹھیوں سے پہچانا گیا راجکماری شانتی بے ہوش حالت میں
ملی گئی اسے بھی ایک ٹرک پر سوار کر دیا گیا مجھے اس وقت اپنے آدمیوں کی نقل و
حرکت بہت گراں گزر رہی تھی جو قلعہ نما حویلی سے سامان نکال نکال کر ٹرکوں

میں سوار کر رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ ڈاکا پچھلے تمام ڈاکوؤں سے زیادہ منفعت بخش تھا۔ کوئی دس گیارہ تجوریاں جوں کی توں مختلف ٹرکوں میں سوار کی گئیں اور درجنوں بکسے اور دوسرا سامان جس میں بندوقیں اور اسلحہ بھی تھا مجھے اس سب سے کوئی دلچسپی نہیں تھیں۔ جیسے تیسے یہ کارروائی پوری ہوئی سیتا پور پر موت کا سا سناٹا طاری تھا جب ہم نے اسے خیرباد کہا۔

یہ پورا قافلہ گول وادی کی طرف روانہ ہوا۔ میرے ساتھ جیپ میں اس وقت گرنام سنگھ جو جیپ بھی چلا رہا تھا۔ رحمان ڈسوزا چرنجی اور رام سروپ تھے۔ اور جیپ کے پیچھے دس ٹرک تھے۔ اس معرکے میں ہمارے بھی کوئی پچاس سے اوپر آدمی مارے گئے تھے جن کی لاشیں بھی ہمارے ساتھ ہی گول وادی جا رہی تھیں۔ پولیس کے کتنے مارے گئے اس کا اندازہ ہمیں نہیں تھا اس لئے کہ جب ہم نے سیتا پور کو چھوڑا تھا تو اس کے ہر گلی کوچے میں لاشیں ہی لاشیں بچھی ہوئی تھیں انہیں یقیناً زبردست جانی نقصان ہوا تھا اور یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے ہماری طاقت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ بھی ہم سے کم تعداد میں معلوم نہیں ہوتے تھے مگر دستی بموں نے انہیں قطعی پسپا کر کے رکھ دیا تھا۔ سیتا پور چھوڑنے سے پہلے میرے آدمی مردہ سپاہیوں کا اسلحہ اپنے ساتھ لانا نہیں بھولے تھے۔

ہمارا قافلہ تیزی کے ساتھ اونچے نیچے ناہموار راستوں پر آگے بڑھتا رہا اور میں اپنے خیالوں میں ایسا کھویا رہا کہ رستے بھر کسی سے کوئی بات نہ کی میں بار بار شوبھا کے مردہ جسم کو دیکھتا اور میری آنکھیں بھیگ جاتیں۔ میرا دل ایک دم اس

ان آشام اور وحشت و بربریت سے بھری ہوئی زندگی سے یکسر اچاٹ ہو گیا۔ میرے لئے ساری دنیا اندھیر ہو گئی شوبھا کے بعد اب اس زندگی میں میرے لئے کچھ نہیں رہا تھا اور شاید وہ شوبھا کی محبت ہی تھی جس نے مجھے یہ زندگی قبول کرنے پر آمادہ کر لیا۔ ورنہ شاید میں یہاں چند دن سے زیادہ رہنا پسند نہ کرتا اور نہ ہی اپنے گروہ کو اتنا مضبوط اور منظم کرنے کی کوشش کرتا۔ ہمارا گروہ یقیناً حد درجہ منظم اور مضبوط تھا اور اسے اس انتہا تک پہنچانے میں رحمان اور ڈسوزا کو بہت دخل تھا۔ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس میں ایک تنظیم اور فوجی ہبرٹ سی پیدا کر دی تھی وادی میں روز نشانے بازی کی باقاعدہ مشق ہوتی تھیں۔ ہر طرح کی جسمانی طاقتوں کا مظاہرہ ہوتا۔ وقت پر اٹھنا اور وقت پر سونا اور اپنے یونٹوں کے کمانڈروں کا حکم ماننا سب کچھ قطعی فوجی انداز میں ہوتا تھا۔ رحمان اور ڈسوزا نے وادی کے دوسرے لوگوں کو بھی اسی زندگی میں ڈھال دیا تھا۔ اور گول وادی کو کسی بڑے ڈاکو کی پناہ گاہ سے کسی فوجی کیمپ میں تبدیل کر دیا تھا۔

قافلہ گول وادی میں داخل ہوا میں نہیں کہہ سکتا کہ نہ جانے کس طرح تمام مراحل طے ہوئے۔ نہ جانے کب شوبھا کی ارتھی مرگھٹ پہنچی اور نہ جانے کس طرح اسے شعلوں نے نگل لیا۔ مجھے یہ سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔ میں نہ رو رہا تھا نہ ہنس رہا تھا اور میری یہ کیفیت سب پر ظاہر تھی۔ سب ہی اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ مجھے شوبھا سے کتنی محبت تھی۔ مرگھٹ سے لوٹ کر بڑے ٹھاکر نے

جب مجھے سینے سے لگا کر رونا شروع کیا۔اور بڑی ٹھکرائن کی بھی آہیں اور سسکیاں میرے کانوں میں پڑیں تو جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا میں بڑے ٹھاکر کے سینے سے لگا زاروقطار رو رہا تھا بالکل کسی بچے کی طرح جس کا کھلونا ٹوٹ گیا ہو۔میری یہ حالت دیکھ کر گرنام سنگھ جیسے پتھر دل شخص کی بھی سسکیاں نکل گئیں جس نے اپنی جوان بہن لاجو کی موت پر بھی خاموشی سے سوائے چند آنسو بہانے کے ضبط سے کام لیا تھا۔ اس وقت جھونپڑے میں وادی کے سب ہی اہم لوگ موجود تھے اور سبھی کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ انہیں اپنے سردار کے دکھ کا پورا اندازہ تھا کس طرح وہ بھیانک اور کالی رات کٹ گئی جس نے میرا سب کچھ چھین لیا تھا میرا سب کچھ شوبھا ہی تو تھی۔

دوسری صبح ایک نیا ہی انقلاب لے کر آئی میں اپنے اندر قطعی بدل چکا تھا میں نے اپنے تمام جاں نثاروں کو جمع کیا اور ان سے کہا۔تم اپنے لئے دوسرا سردار اپنے آپ ہی میں سے مقرر کرلو۔اب میں اس کام کے لئے قطعی موزوں نہیں ہوں۔

وہ سب میری بات سنکر دنگ رہ گئے اور ایک ساتھ بولے۔''ناممکن ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔'' میں نے پھر کہا۔''اگر یہ ناممکن ہے کہ تم لوگ میری جگہ کسی دوسرے سردار کو قبول کرو تو ایک دوسری راہ بھی ہے وہ یہ کہ یہ زندگی ترک کرو، قتل غارت گری کا یہ بازار بند کردو جس میں بیویاں اپنے شوہروں سے بہنیں اپنے بھائیوں سے اور مائیں اپنے بیٹوں سے محروم کردی جاتی ہیں۔

بولو! میں میں تمہارا جواب سننے کا منتظر ہوں۔''میری یہ بات ان کے لئے پہلی بات سے زیادہ حیرت انگیز اور عجیب تھی انہیں جیسے سکتہ سا ہوگیا۔آخر کار وہ بولے۔''مگر کس طرح سردار! یہ کیسے ممکن ہے؟ میں نے کہا۔''تم یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔میں جانتا ہوں کہ یہ فیصلہ اس قدر آسان نہیں کہ فوراً جواب دیا جاسکے۔ میں تمہیں شام تک سوچنے کا موقعہ دیتا ہوں۔میں نے تم سب کو اس لئے بلایا کہ مجھے تمام وادی بھر میں تم لوگ سب سے زیادہ عزیز ہو۔اور بغیر تمہاری مرضی ومنشا کے میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا۔اور میں اس حقیقت سے بھی آگاہ ہوں کہ تم لوگ بھی دنیا کی ہر چیز سے زیادہ مجھ سے محبت کرتے ہو فی الحال میری باتیں اپنے آپ ہی تک محدود رکھو اور یاد رہے کہ یا تو تم کوئی دوسرا سردار منتخب کرنے کا فیصلہ کرو گے یا اس وحشت و بربریت کی زندگی کو ترک کردینے کا فیصلہ۔ان دونوں میں سے تمہیں کوئی ایک فیصلہ کرنا ہے۔اگر تم نے دوسرا فیصلہ کیا کہ یہ زندگی ترک کرنے پر آمادہ ہو تو مجھے بھی اپنے ہمراہ پاؤ گے۔نہیں!......اتنی جلدی نہیں تم شام کو پھر یہیں مجھ سے ملو گے۔اس وقت مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' میں نے دانستہ اس وقت یہ میٹنگ رحمان اور ڈسوزا کے جھونپڑے میں رکھی تھی جو ساتھ ساتھ ایک کشادہ جھونپڑے میں رہتے تھے۔رحمان نئے جھونپڑوں کی تعمیر کے بعد ہمارے بڑے جھونپڑے سے یہاں اٹھ آیا تھا۔وہ سب لوگ اپنے اپنے کاموں پر چلے گئے غالباً بڑے جھونپڑے جہاں آج ڈاکے کا مال تقسیم ہونے والا تھا اور یہ کام خاص طور پر بڑے ٹھاکر کے سپرد تھا۔میں تنہا اس جھونپڑے میں رہ گیا۔اور ان

کے جانے کے بعد بے چینی سے ٹہلنے لگا میرا ذہن اس وقت بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے اپنے جاں نثار ساتھیوں پر اعتماد تھا کہ وہ میرے حق میں فیصلہ دیں گے مگر ابھی شام بہت دور تھی۔ میں ٹہلتے ٹہلتے تھک کر ایک پیاں دار نرم بستر پر لیٹ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں میری آنکھ لگ گئی۔

یہ دوپہر تھی جب میری آنکھ کھلی۔ میں نے دیکھا کہ جھونپڑے کے چبوترے پر رحمان اور ڈسوندا بیٹھے ہوئے کھانا کھانے میں مصروف ہیں۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر کھانے کے لئے اصرار کیا۔ مگر اس وقت مجھے قطعی بھوک پیاس نہیں تھی۔ حالانکہ کل سے اب تک میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میں نے انکار کر دیا اور وہ دونوں پھر کھانا کھانے میں لگ گئے۔ میں اٹھا اور منہ ہاتھ دھو کر جھونپڑے میں جاؤں ٹہلنے لگا۔ میرا جی اس وقت بالکل یہ نہیں چاہتا تھا کہ بڑے جھونپڑے میں جہاں میں نے شوبھا کے ساتھ اپنی زندگی کے بہترین دن گزارے تھے۔ مجھے یہ سوچ کر ہی وحشت سی ہوئی کہ اب وہاں شوبھا نہیں ہوگی اور میں اس تنہائی کو برداشت کرنے کا اہل اپنے آپ کو نہیں پا رہا تھا بڑے ٹھاکر اور ٹھکرائن کو شاید میرے یہاں ہونے کی اطلاع مل چکی تھی اور مجھے رحمان سے معلوم ہوا کہ جب سے میں سویا ہوں وہ دونوں کئی مرتبہ چکر لگا کر جا چکے ہیں۔ پچھلی رات ایک لمحے کو بھی میری پلک نہیں جھپکی تھی اور میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا تھا مجھے ابھی جاگے ہوئے کچھ دیر ہی ہوئی ہوگی کہ پھر وہ دونوں جھونپڑے میں داخل ہوئے بڑے ٹھاکر بولے۔ ان کا لہجہ نہایت غمگین تھا۔ ''رنجیتے! چل ہمارے ساتھ جھونپڑے میں

چل ہمیں اکیلا پن کھائے جا رہا ہے۔ ہم تیرے بغیر وہاں نہیں رہ سکتے۔ ان کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

میں نے بھی رندھے گلے کے ساتھ کہا۔ بابا اب میں وہاں کس طرح جاؤں اگر میں وہاں رہا تو پاگل ہو جاؤں گا وہاں مجھے ہر گھڑی شوبھا کی یاد ستاتی ہے۔''

میری بات سن کر بڑے ٹھاکر کا سر جھک گیا۔ ''تو پھر ہمیں بھی اپنے ہی ساتھ رکھ جہاں تو رہے گا وہیں ہم رہیں گے تو کیا سمجھتا ہے کہ ہمارا کلیجہ منہ کو نہیں آتا۔ صبر کر میرے بیٹے صبر کر، سب کو ایک دن مرنا ہے میں چیخ پڑا۔ ''مگر بابا! کیا اسے ابھی مرنا تھا کیا اس کے مرنے کے یہ دن تھے بولو؟ میں نے بابا کو پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ ان کے رخساروں پر آنسو بہہ بہہ کر ان کی سفید بے داغ داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ آخر کار بولے۔ رنجیتے! مجھے تیرے دکھ کا اندازہ ہے یہ دن تو تمہارے ہنسنے کھیلنے کے تھے۔ تم دونوں جوان تھے مگر شوبھا تجھے اور ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔ تو اکیلا رہ گیا۔ میرے دل میں جھانک رنجیتے! اس باپ کے دل میں جھانک جس پر جوان اولاد کی موت کا داغ ہے۔ مگر میں نے صبر کیا تیرے لئے صبر کیا۔ اب اگر تو نے بھی مجھے تنہا چھوڑ دیا تو میں ایک دن زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ ہم جھونپڑا بدل دیں گے رنجیتے مگر تو ہمارے ساتھ رہے گا۔'' انہوں نے اپنے آنسو اپنے لمبے کرتے سے پونچھتے ہوئے۔

''میں آج رات یہیں رہوں گا! کل جب سب کچھ بدل جائے گا بابا میں

تمہارے پاس جاؤں گا۔'' میں کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا اور میری بات سنکر بڑے ٹھاکر اور ٹھکرائن سر جھکائے واپس چلے گئے میں پھر نڈھال ہو کر بستر گر پڑا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ رحمان اور ڈسوزا میرے پاس آ گئے۔ وہ کھانا ختم کر چکے تھے انہوں نے مجھے تسلیاں دیں مجھے طرح طرح سے بہلانے کی کوشش کی مگر میرا جی نہ بہلنا تھا نہ بہلا اسی طرح شام ہوگئی۔

جھونپڑے میں ایک ایک کر کے گرنام سنگھ چرنجی اور رام سروپ داخل ہوئے اور رحمان اور ڈسوزا میرے پاس موجود تھے ہی۔ میں ان کا فیصلہ سننے کا منتظر تھا وہ سب آ کر سر جھکائے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ میں بھی بستر سے اٹھا اور منہ دھو کر ان کے ساتھ آ کر چبوترے پر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے گرنام سنگھ نے لب کشائی کی۔'' سردار! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جو بھی آپ کا حکم ہوگا ہم بغیر چوں و چرا اس کی تعمیل کریں گے لیکن ہمیں یہ منظور نہیں کہ آپ کے علاوہ کسی اور کو سردار بنالیں۔ بقیہ حضرات نے بھی اس کی تائید کی۔

پھر رحمان بولا۔ مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اگر ہم نے یہ زندگی ترک کر دی تو پھانسی کے پھندے سے بچے رہیں گے؟

ہم جتنے لوگ اس وقت یہاں موجود ہیں ان میں سے کسی کو بھی آپ کے حکم پر پھانسی کا پھندا قبول کرنے سے بھی انکار نہیں لیکن وادی کے باقی لوگوں کی زندگیوں کو اپنی مرضی پر قربان کرنا ہم نہیں چاہتے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کے ذہن میں ضرور ایسا کوئی حل ہوگا جس سے وادی کے دوسرے لوگوں کی زندگیاں محفوظ

ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر میری طرف دیکھنے لگا اور بقیہ لوگ بھی مجسم بن گئے۔

اب میں نے کہنا شروع کیا۔'' میرے جاں نثارو مجھے تمہارے اوپر فخر ہے اور اگر مجھے تم پر اتنا اعتماد نہ ہوتا تو ہرگز تم سے وہ باتیں نہ کہتا جو آج صبح میں نے تم سے کہیں۔ تمہارے فیصلے نے میری نظر میں تمہاری عزت اور بڑھا دی۔ رے ذہن میں یقیناً ایک تجویز ہے اگر وہ کارگر ہو جائے اور مجھے تم سب پر پورا تماد اور بھروسا ہے کہ تم لوگ میری تجویز کو قبول کر لو گے وہ تجویز بتانے سے پہلے ں تم سے عہد لینا چاہتا ہوں کہ تم اس پر عمل کرو گے اس عہد کا مقصد یہ نہیں کہ مجھے تم یقین نہیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ کہیں تم میری محبت میں اس سے انکار نہ کر دو۔ تو بولو کیا تم میرے سر پر ہاتھ رکھ کر عہد کرنے کو تیار ہو کہ جو میں تجویز پیش کروں گا اس سے تم اتفاق کرو گے؟ میری بات سن کر باری باری تمام لوگ اٹھے اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر عہد کیا کہ میں جو بھی تجویز رکھوں گا اس سے وہ مرتے دم تک انحراف نہیں کریں گے اور اسے پورا کریں گے۔

لیکن جب میں نے وہ تجویز رکھی تو سنکر سب سناٹے میں آ گئے۔ تجویز یہ تھی گورنر صاحب کو ایک خط لکھا جائے گا جسے رحمان ان تک بذات خود لے کر جائے گا۔ اس خط کی عبادت اس طرح ہوگی کہ میں بدنام زمانہ ڈاکو رنجیت سنگھ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنا چاہتا ہوں اور حکومت سے اپیل کرتا ہوں کہ مجھے وہ میرے جرائم کی پاداش میں سزائے موت دے دے تاکہ دوسرے قانون شکنوں کو عبرت حاصل ہو۔ میں اپنے تقریباً ایک ہزار ساتھیوں سمیت خود کو قانون کے

حوالے کر دوں گا جس میں عورتیں' بوڑھے بچے سب ہی ہوں گے لیکن میری صرف
ایک شرط ہے وہ یہ کہ میرے تمام ساتھیوں کو باعزت زندگی گزارنے کی اجازت
دی جائے اور حکومت انہیں معاف کر دے۔ میں اپنے ساتھ کروڑوں روپے کی
کرنسی اور کروڑوں ہی روپے کے ہیرے جواہرات اور سونا چاندی سینکڑوں
رائفلیں اور بندوقیں اور دوسرا اسلحہ بھی ان لوگوں کے بدلے حکومت کی تحویل میں
جمع کرا دوں گا۔ صرف میری اتنی خواہش ہے کہ میرے ساتھیوں کو جن میں سات سو
کے قریب پولیس کے آدمی بھی شامل ہیں جو مصلحتہً اتنے دن میرے ساتھی بنے
رہے حکومت انہیں قطعی معاف کر دے میں یہ زندگی آئی جی رحمان اور ڈی آئی جی
ڈسوزا کے کہنے پر ترک کر رہا ہوں جنہوں نے مجھے اپنے دلائل اور محبت سے قائل
کر دیا ہے کہ یہ زندگی لعنت کے سوا کچھ نہیں۔'' میں جب ان الفاظ پر آیا تو رحمان
اور ڈسوزا کے ساتھ بقیہ لوگ سوائے گرنام سنگھ کے چونکے میں نے پھر کہنا شروع
کیا۔'' میں یہ صفائی بھی پیش کر دوں کہ جب آئی جی رحمان اور ڈی آئی جی ڈسوزا
کے ساتھ میں نے ان کے بقیہ سپاہیوں کو بھی زیر کر لیا تو آئی جی رحمان اور ڈسوزا
نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے اور اپنے سپاہیوں اور اپنی زندگیوں کو بچانے کے
لئے عارضی طور پر میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور جو کام وہ طاقت کے ذریعے
نہ کر سکے انہوں نے محبت سے انجام کر دیا۔ اس تمام عرصے میں انہوں نے میری
کایا پلٹ دی اور میرا اعتماد حاصل کرنے کے لئے میری شانہ بشانہ کام بھی کیا۔ مگر یہ
سب کچھ قانون کی افضلیت اور اس کی برتری کے لئے تھا۔ انجام کار ان کی کوششیں

ار آور ہوئیں اور میں رفتہ رفتہ یکسر بدل گیا۔ اب میں خود کو قانون اور انصاف کے
سپرد کرتا ہوں۔''

وہ لوگ میری تجویز سنکر بے چین سے ہو گئے اور خصوصاً رحمان اور ڈسوزا
کے ذہن میں تو متعدد سوالات گردش کرنے لگے۔ آخر کار گرنام سنگھ نے پھر بولنے
ں پہل کی۔ اس کا گلا رندھا ہوا تھا'' سردار یہ تجویز بہت مہنگی ہے۔ ہم آپ کی
ان کی قربانی دے کر زندہ نہیں رہنا چاہیے ہرگز نہیں۔'' بقیہ حضرات بھی گرنام سنگھ
ی اس بات سے اتفاق کرنے لگے۔ میں نے سختی سے کہا۔'' تم لوگ میرے سر پر
تھ رکھ کر ابھی کچھ دیر پہلے عہد کر چکے ہو کہ میری تجویز سے انحراف مرتے تم تک
یں کرو گے۔ تمہیں وہی کرنا ہے جو میرا حکم ہے۔'' ان کے سر جھک گئے۔ میں
نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ میرا بھی جی یہ منظر دیکھ کر بھر آیا اور بے
ختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ تاکہ وہ میرے آنسو دیکھ
ر ہمت نہ چھوڑ بیٹھیں۔ اب رحمان کے بولنے کی باری تھی اور ڈسوزا بھی کچھ
لنے کے لئے پہلو بدل رہا تھا۔ آخر کار رحمان بولا۔'' مگر سردار! میں آئی جی کب
ں میں تو صرف آپ کا ساتھی ہوں۔ صرف ایک ڈاکے کے دوران میں نے آپ
ے حکم پر یہ فرض ادا کیا تھا۔ پھر میں نے اخباروں میں بھی اپنی تصویریں دیکھیں
ن میں مجھے آئی جی اور ڈسوزا کو ڈی آئی جی لکھا گیا تھا مگر یہ سب تو ایک فرضی کہانی
ی۔ نہ معلوم حکومت تک میری اور ڈسوزا کی تصویریں کس طرح پہنچ گئیں۔ یہ معما
ب تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔؟ میں نہیں سمجھتا کہ حکومت واقعی وہی سمجھتی ہے جو

اخباروں میں چھپا ہے۔ مجھے تو یہ حکومت کی کوئی چال معلوم ہوتی ہے جس سے وہ مجھے اور ڈسوزا کو پھانسا چاہتی تھی۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک ڈاکو کے ساتھی اور حکومت کے ذمہ دار افسران۔؟ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ یہ سب کیا ماجرا ہے؟

اس پر میں نے کہا ''تمہاری سمجھ میں سب کچھ آجائے گا۔ اور ڈسوزا بھی سب کچھ سمجھ جائے گا۔ ادھر میری آنکھوں میں دیکھو! رحمان نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ اب اسے ایک جھٹکا سا لگا اور مجھے بھی۔

میں نے اسے اپنے ذہن سے اور پراسرار قوتوں کے ذریعے اپنے قابو میں کرلیا تھا۔ میرے ذہن نے اس کے ذہن سے کہنا شروع کیا۔ ''تم یقین کرو کہ تم آئی جی رحمان ہو تمہیں اب سے کچھ دن پہلے کی وہ شام یاد آرہی ہے جب تم نے ڈسوزا کے ساتھ پولیس کی بھاری تعداد میں مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ کے ٹھکانے گول وادی پر حملہ کیا تھا۔ تم اپنی پچھلی زندگی یاد کررہے ہو۔ تمہیں سب کچھ یاد آگیا ہے اپنے سپاہیوں سے تم ہتھیار پھینکنے کے لئے کہہ رہے ہو اس لئے کہ تم دو طرف سے گھر چکے ہو۔ اب تمہیں سب کچھ یاد آچکا ہے تم نے مصلحتاً اپنے آدمیوں کی زندگی بچانے کے لئے سردار رنجیت سنگھ سے عارضی طور پر دوستی کرلی ہے اور تم حقیقت میں اس کے جاں نثار بن چکے ہو۔ مگر تم اسے رفتہ رفتہ راہ راست پر لاکر اس زندگی سے نفرت پیدا کرارہے ہو۔ تمہیں سردار سے بے پناہ محبت ہوگئی ہے۔ تم وادی کی زندگی قطعی نہیں بھولتے تمہیں سب کچھ یاد ہے مگر یہ سب کچھ تم نے قانون

کی بالادستی کے لئے کیا ہے۔ تم اب بھی سردار کو بے پناہ چاہتے ہو مگر اپنے فرض اور قانون کے ہاتھوں مجبور ہو کر تم سردار کو اسی کے کہنے پر قانون کے حوالے کردو گے۔ میں نے اس کے ذہن کو قطعی آئینہ کردیا اور اب جو اس کی آنکھوں سے آنکھیں جدا کیں تو وہ اور ہی شخص تھا۔

اس کے چہرے پر عجیب سی الجھن تھی وہ اچانک بولا سردار! میں آئی جی رحمان آپ سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ ایک طرف آپ کی محبت ہے دوسری طرف فرض مجھے آواز دے رہا ہے میں کیا کروں؟ میں فیصلہ نہیں کرپارہا۔'' ڈسوزا اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا اور باقی لوگ بھی میں نے اس سے کہا۔ ''رحمان! ہمیشہ سے دنیا کا یہ دستور رہا ہے اور ہمیشہ بڑے لوگوں نے قانون اور فرض پر محبت کو قربان کیا ہے۔ تم بھی ایک بڑے آدمی ہو۔ تمہیں بھی یہی کرنا چاہئے اور تم یہی کرو گے۔'' یہ کہنے کے بعد میں اب ڈسوزا سے مخاطب ہوا۔ اب تم آجاؤ ڈسوزا تمہاری بھی حیرت دور کردوں۔ اب ڈسوزا! کا ذہن میرے قابو میں تھا یہ ذہن بہت خطرناک تھا اس لئے میں پوری توجہ اس پر دے رہا تھا اور آہستہ آہستہ اسے سب کچھ یاد دلا رہا تھا میں نے بہت مشکل سے اس کے ذہن سے انتقامی جذبے کو نکالا۔ اور اپنے ذہن سے اس کے ذہن کو حکم دیا۔

''ڈسوزا! اب تم پوری طرح اپنی پچھلی زندگی میں واپس جاچکے ہو مگر جس نے تمہارے باپ کو قتل کیا تھا وہ سردار میں نہیں تھا بلکہ میرا دادا تھا جو مرچکا ہے اس لئے تمہیں اپنے باپ کا انتقام اپنے ذہن سے قطعی نکال دینا چاہئے اور

اس لئے بھی کہ تم موجودہ سردار رنجیت سنگھ سے اپنے ماں باپ سے زیادہ محبت کرتے ہو۔'' اس طرح آخر کار وہ شخص بھی راہ راست پر آ گیا جس نے اپنی جوانی میں اپنے باپ کی موت کی خبر پا کر عہد کیا تھا کر ڈاکو رنجیت سنگھ سے اپنے باپ کا انتقام لے گا۔ اور لندن سے جس نے ہندوستان کا سفر اسی لئے کیا تھا اور پولیس میں نوکری بھی اسی غرض سے کی تھی۔ وہ اب سر جھکائے رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔'' میں میں اپنے فادر کی روح سے شرمندہ ہوں میں ان کا انتقام نہیں لے سکا۔ مگر یہ اب میرے بس ہی میں کب ہے۔ وہ شخص مر چکا جس نے میرے فادر کو مارا تھا۔ سردار! ہم آپ کو چاہتا ہے اور اب ہم خود اپنے ہاتھوں سے آپ کو قانون کے حوالے کریگا۔ ہمارا تو سب کچھ آپ تھا۔ ہمارا باپ مرا پھر ماں مرا۔ ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا آپ تھا۔ مگر آپ بھی ہمارا ساتھ چھوڑ گیا سردار! ڈسوزا یہ کہہ کر مجھ سے لپٹ کر رونے لگا اور باقی لوگ حیرت اور رحم کے ملے جلے جذبے کے ساتھ اسے سمجھانے لگے۔ میں نے بقیہ تمام لوگوں کو ان دونوں کے حالات سے آگاہ کیا اور کہا کہ یہ لوگ میری محبت میں دانستہ اپنی پچھلی زندگی ترک کر کے میرے ساتھ آ گئے تھے۔ مگر اب جب کہ میں انہیں پھر اس زندگی میں واپس کرنا چاہتا ہوں یہ رو رہے ہیں۔ مگر ایسا ضرور ہو گا۔ ضرور۔! میں اس زندگی سے بیزار ہو چکا ہوں اور نہیں چاہتا کہ میرے جاں نثار ساتھی وہ زندگی بسر کریں جو قابل نفرت ہے۔

وہ سب میری تجویز سے اتفاق کرنے پر مجبور تھے اس لئے کہ وہ عہد کر چکے تھے۔ وہ سر جھکائے غمزدہ بیٹھے تھے جیسے انہوں نے ابھی ابھی اپنے کسی عزیز

کے انتقام کی خبر سنی ہو۔ آخر کار میں نے خاموشی کو توڑا۔'' ابھی یہ تجویز تم لوگوں تک ہی محدود رہنی چاہئے اس لئے کہ بہت کام باقی ہے۔ مجھے یہ بھی سوچنا ہے کہ وادی کے بقیہ لوگوں کو اس تجویز پر عمل کرنے کے لئے کس طرح تیار کیا جائے کیونکہ ان میں سے اکثر نے تو پوری زندگی ہی اس ماحول میں گزاری ہے اور کسی قیمت پر اسے ترک کرنے پر تیار نہیں ہوں گے۔ بہت سے اسی ماحول میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے ہیں اور میں اس بات سے بخوبی واقف ہوں کہ تم لوگوں کی طرح سب ہی مجھے اتنا نہیں چاہتے کہ بغیر کسی دباؤ کے میری بات مان لیں اور اپنی زندگیاں یکسر بدل دیں۔ مگر میں عہد کر چکا ہوں کہ اب ایسا ہی ہو گا اور پھر بڑے ٹھاکر اور بڑی ٹھکرائین کا بھی مسئلہ ہے انہیں ابھی جوان بیٹی کا داغ لگا ہے۔ ان کے زخم ابھی مندمل بھی نہیں ہوئے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے آنسو تو خشک بھی نہیں ہوئے کہ انہیں۔ یہ اطلاع دے دی جائے کہ جسے تم نے اپنی اولاد کی طرح پالا پوسا ہے اور اولاد کی ہی طرح چاہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو پھانسی کے پھندے کے سپرد کر رہا ہے ابھی بہت کچھ سوچنا ہے۔ خیر یہ سب میں کر لوں گا۔ میرے ذہن میں تمام ں موجود ہیں۔'' اب میں گرنام سنگھ سے مخاطب ہوا۔'' گرنام! تم بتاؤ کہ وہ تمہاری راج کماری شانتی کیا کہتی ہے؟ کیا وہ تمہارے ساتھ شادی پر تیار ہے؟۔''

گرنام سنگھ نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔'' اسے چھوڑیئے سردار! مجھے اب اس میں یا دنیا کی کسی دوسری بات میں کوئی دلچسپی نہیں میرے لئے اس وقت سب سے اہم مسئلہ خود میرا عہد ہے جس پر اب میں پچھتا رہا ہوں۔ میں

نے جتنی محبت آپ سے کی ہے اسے بتانے یا جتانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ کہتے ہوئے بھی مجھے فخر ہے کہ میں نے جتنا آپ کو چاہا ہے اتنا کسی کو نہیں۔ کسی کو بھی نہیں۔'' یہ کہتے کہتے وہ رو پڑا۔

میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی اور کہا۔'' گرنام! سب کچھ بھول جاؤ۔ جو کچھ گزرا ہے۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب تم اپنی زندگی کو بہتر اور خوشحال، پر امن طور پر گزارو گے تو میری روح کو تسکین ہو گی اور اس کا واحد راستہ یہی ہے کہ تمہاری شادی راجکماری شانتی سے کر دی جائے۔'' میری بات سن کر اس مرتبہ چرنجی بولا۔'' سردار وہ تو گرنام کو دیکھ کر ہی بے ہوش ہو گئی۔ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ بہت نازک مزاج ہے وہ لڑکی۔'' پھر رام سروپ نے لقمہ دیا۔'' وہ گرنام کے آدھے جلے ہوئے بھیانک چہرے کو برداشت نہیں کر سکی۔ میں خود اس وقت وہاں موجود تھا۔'' اس پر رام سروپ کچھ خجل سا ہو کر گرنام سنگھ کو دیکھنے لگا اس لئے کہ بات کہنے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ اس طرح اس نے گرنام سنگھ کو تکلیف پہنچائی ہے۔ وہ اس سے معذرت کرنے لگا۔

گرنام سنگھ بولا۔'' ہاں میرا چہرہ اتنا ہی بھیانک ہے کہ مجھے کوئی نہیں چاہ سکتا۔ سوائے سردار کے مگر......'' یہ کہہ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اپنا فقرہ ادھورا ہی چھوڑ کر سر جھکا لیا۔ مجھے اس کے دکھ کا اندازہ تھا اس لئے کہ اب تو اس سے محبت کرنے والی ایک واحد ہستی یعنی اس کی ماں بھی اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی اور چاہنے والی بہن لاجو تو پہلے ہی مجھ پر قربان ہو چکی تھی۔ اب تو اس کی

چھوٹی سی دنیا میں اس کا سب کچھ میں ہی تھا وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا بلکہ اس کے ایک ایک لفظ میں صداقت تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال کوندا اور میں نے گرنام سنگھ سے کہا۔'' گرنام! یہ بتاؤ! اس وقت راج کماری کہاں ہے؟ وہ حیران سا میری طرف دیکھ کر بولا۔'' میرے جھونپڑے میں۔ مگر میں اس جھونپڑے میں کس طرح جا سکتا ہوں؟ وہ مجھے دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے اور جب میں جھونپڑے میں بغیر داخل ہوئے باہر ہی کھڑے اسے دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو اندر سے سوائے سسکیوں اور رونے کے کچھ آواز سنائی نہیں دیتی۔'' اس نے یہ کہہ کر پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔

'' گرنام میں تم سے رخصت ہونے سے پہلے تمہیں ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ وہ تحفہ راجکماری ہے اور......''

وہ میری بات کاٹ کر بولا۔'' مگر سردار......''

میں نے بھی اس کی بات کاٹ کر کہا۔'' یہ سب تم میرے اوپر چھوڑ دو۔ مجھے وہاں لے چلو۔ ابھی اسی وقت آج رات ہی تمہاری شادی اس کے ساتھ کر دی جائے گی'' چرنجی اور رام سروپ وغیرہ سب حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔ مگر شاید گرنام سنگھ کو میری بات کی صداقت پر کچھ یقین سا تھا اس لئے کہ وہ اب تک بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔ آئی جی رحمان اور ڈسوزا وغیرہ کی نفرتوں کو محبت میں بدلتے ہوئے اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ میرے ساتھ اٹھا چرنجی اور رام سروپ اپنے جھونپڑوں کو روانہ ہو گئے۔

گرنام سنگھ اپنے جھونپڑے کا تالا کھول کر باہر رک گیا۔اب دن مند چکا
تھا۔جھونپڑی کے اندر اندھیرا تھا میں نے جیسے ہی جھونپڑی میں قدم رکھا لڑکی کی
چیخ نکلی مگر میں نے فوراً اس سے کہا۔''میں گرنام سنگھ نہیں ہوں بلکہ تمہیں اس قید سے
رہائی دلانے آیا ہوں اس لئے خاموش رہو۔'' میری بات سن کر لڑکی چپ ہوگئی۔
میں پھر جھونپڑے کے باہر گیا اور آہستہ سے گرنام سنگھ سے کہا۔''قریبی جھونپڑے
سے مشعل مانگ لو۔'' وہ مشعل لے آیا اور اس سے میں گرنام سنگھ کے جھونپڑے کی
مشعل روشن کر کے اسے باہر جا کر پھر واپس کر آیا اور جھونپڑے کے کواڑ بھیڑ
دیئے۔اب میں نے اسے دیکھا۔وہ لڑکی واقعی بہت حسین تھی۔پتلے پتلے نازک
نازک سرخ ہونٹ، بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت ناچتی ہوئی، بڑے بڑے کھلے
ہوئے بال گلے میں قیمتی موتیوں کے ہار۔اور ہاتھوں میں جگمگ کرتی سونے کی
انگوٹھیاں، پتلی دبلی پھول جیسی حسین راجکماری اس وقت بھی بہت خوبصورت لگ
رہی تھی۔وہ پیالی دار بستر پر گھٹنوں پر اپنی ٹھوڑی رکھے مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی
آخر اس کی میٹھی آواز سنائی دی جیسے کہیں دور کسی مندر کی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔''

''کون ہو تم......؟'' بظاہر یہ تین لفظ تھے مگر ان میں اتنا رس تھا جس کی
مٹھاس میں نے اپنی روح تک میں محسوس کی میں نے اس کی بات کا جواب دیا''
میں تمہارا ایک خیر خواہ ہوں راجکماری۔دیکھو ادھر دیکھو......''

اور جیسے ہی اس کی آنکھیں میری آنکھوں سے ملیں وہ پوری طرح میرے
قابو میں تھی۔اب میرا ذہن اسے حکم دے رہا تھا''تم قطعی اپنی پچھلی زندگی بھول جاؤ

گی۔تم اپنی پچھلی زندگی بھول چکی ہو۔تم کون تھیں؟ تم نہیں جانتیں۔تم صرف اتنا
جانتی ہو کہ تم گرنام سنگھ کو بے انتہا چاہتی ہو اور وہ بھی تم پر جان دیتا ہے۔تم اس کے
بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں۔تمہیں اس کے چہرے سے بھی پیار ہے تم اس کی صورت
دیکھ کر قطعی نہیں ڈرتیں بلکہ تمہیں اس پر پیار آتا ہے تمہارا سب کچھ گرنام سنگھ ہے۔تم
اسی کے لئے پیدا ہوئی۔ہو تم کو اس سے عشق ہے تم اس کے لئے اپنی جان تک
دے سکتی ہو۔اور تم ہوش میں آنے کے بعد یہ سب کچھ بھول جاؤ گی۔میں تمہارا
سردار رنجیت سنگھ ہوں جس کو تم اسی طرح چاہتی ہو جس طرح تمہارا گرنام اسے چاہتا
ہے۔تمہارا سردار تمہارے بڑے بھائی کی جگہ ہے۔'' اور یہ کہہ کر میں نے اس کی
آنکھوں سے اپنی آنکھیں جدا کر لیں۔اسے ایک جھٹکا سا لگا اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ
ہوش میں آگئی۔مجھے دیکھتے ہی وہ بولی۔'' سردار! گرنام سنگھ کہاں گیا ہے؟ صبح
سے اس کا پتا نہیں۔'' میں نے کہا وہ باہر ہی ہے ابھی بھیجتا ہوں۔یہ کہہ کر باہر ہی
نکلا تھا کہ گرنام سنگھ مجھ سے لپٹ گیا اور بے اختیار میری پیشانی کا بھوسہ لے لیا
میں نے کہا''جاؤ گرنام! راج کماری تمہارا انتظار کر رہی ہے۔میری طرف سے یہ
تحفہ قبول کرو۔آج ہی رات تم دونوں کی شادی کر دی جائے گی۔نیک کام میں دیر
کیا۔کیا تم اس پر راضی ہو۔؟'' وہ کیا کہتا اس کی خوشی چھلکی پڑ رہی تھی۔''بہتر ہے
سردار! جو آپ کا حکم'' کہہ جھونپڑے میں چلا گیا۔اور جاتے جاتے میں نے دیکھا
کہ راج کماری اس کی آغوش میں سمٹ آئی ہے۔اور وہ اس پر جھکا ہوا ہے میرے
سینے سے جیسے ایک بوجھ ہلکا ہو گیا۔اب میں یہ خوشخبری بڑے ٹھاکر کو سنانا چاہتا تھا

اس لئے خود بہ خود میرے قدم بڑے جھونپڑے کی طرف اٹھ گئے۔

میں بڑے جھونپڑے پہنچا تو دیکھا وہ سنسان پڑا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجھے دیکھ کر ایک نوجوان جو میرا پڑوسی ہی تھا آگے بڑھا۔ ''سردار بڑے ٹھاکر نے جھونپڑا بدل دیا ہے۔ اب وہ اس سے تیسری گلی میں چلے گئے ہیں۔ وہاں ایک جھونپڑا خالی پڑا تھا۔ اس لئے کہ اس میں گنیشی رہتا تھا جو تنہا تھا مگر آخری ڈاکے میں وہ مارا گیا۔ سردار بڑے ٹھاکر اب اس کے جھونپڑے میں چلے گئے ہیں اور سارا سامان بھی وہیں پہنچا دیا گیا ہے۔'' نوجوان کی بات سنکر میں آگے بڑھ گیا تیسری گلی قریب ہی تھی۔ میں ادھر چلنے لگا۔ نوجوان کی بات سے میرے دل کو دھکا سا لگا۔ تو اب یہ بڑا جھونپڑا ہمیشہ کے لئے ویران ہو گیا جس میں کبھی شوبھا زندگی سے بھرپور قہقہے لگایا کرتی تھی۔ میں یہی سب کچھ سوچتا ہوا اس جھونپڑے تک پہنچ گیا جس کا پتا اس نوجوان نے بتایا تھا۔ میں جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ لیکن وہاں بڑے ٹھاکر موجود نہیں تھے۔ مجھے دیکھ کر بڑی ٹھکرائین آگے بڑھیں۔ وہ محبت بھرے لہجے میں بولیں۔ ''تو آ گیا میرے لال! دیکھو ہم نے تیرے لئے وہ منحوس جھونپڑا چھوڑ دیا۔ بڑے ٹھاکر تجھے ہی لینے رحمان کے یہاں گئے ہیں۔ اب آتے ہی ہوں گے۔ بیٹھ جانا! میں ان کے کہنے پر چبوترے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بڑے ٹھاکر آ گئے۔'' میں تجھے کہاں کہاں دیکھتا پھرا میرے چاند! اور تو یہاں موجود ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تو نے آج گرنام سنگھ اور راجکماری کی شادی کا اعلان کر دیا یہ اچھی بات ہے اس بیچارے کا گھر بس گیا۔ بالکل اکیلا تھا

جب سے ماں مری تھی۔ افسردہ رہنے لگا تھا۔ مجھے اتنی دیر اسی لئے ہوئی کہ میں اس کی شادی کا انتظام کر رہا تھا۔ مجھے گرنام سے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔'' یہ سنتے ہی میں چونک پڑا کہ کہیں گرنام سنگھ نے بڑے ٹھاکر کو یہ تو نہیں بتا دیا کہ میرا آئندہ کیا ارادہ ہے؟ مگر یہ کس طرح ہو سکتا ہے اور یہ سوچتے ہی میں نے بڑے ٹھاکر سے کہا۔ ''کیا معلوم ہو گیا بابا۔''

وہ بولے۔ ''یہی کہ تیری مرضی ہے کہ آج ہی ان دونوں کی شادی ہو جائے اور کیا۔'' میں نے جب یہ سنا تو جان میں جان آئی۔

اب سے کچھ دن پہلے جہاں دولھا بنا میں منڈپ کے پھیرے لگا رہا تھا اور شوبھا کی ساری کا دامن میرے کرتے سے بندھا ہوا تھا آج وہاں میرا ساتھی اور جاں نثار گرنام سنگھ راجکماری کے ساتھ اسی طرح پھیرے لگا رہا تھا اور میں جی ہی جی میں اس بات سے خوش تھا کہ میں نے گرنام سنگھ کا مستقبل محفوظ کر دیا ہے۔ اب کوئی راجہ شمشیر سنگھ کسی ڈاکے کے دوران کسی شوبھا کو نشانہ نہیں بنا پائے گا۔ شادی کی رسمیں خوش اسلوبی کے ساتھ طے پا گئیں۔ لڑکی کی طرف سے میں اور لڑکے کی طرف سے بڑے ٹھاکر تمام فرائض ادا کر رہے تھے۔ جب یہ سارا ہنگامہ ختم ہوا۔ میں بڑے ٹھاکر کے ساتھ بڑے میدان سے اپنے نئے جھونپڑے کی طرف روانہ ہو گیا جس میں رہنا شاید مجھے ایک آدھ دن ہی نصیب ہونا تھا۔

دوسرے دن صبح اٹھتے ہی میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بڑے ٹھاکر کے ذہن کو قابو میں کر کے اس میں اس قتل و غارت گری کی زندگی کے خلاف

نفرت بھردی۔ بہت حد تک میں نے شوبھا کا غم بھی ان کے ذہن سے نکال دیا۔ مگر کاش کوئی میرے ذہن سے یہ بوجھ ہلکا کرسکتا۔ میں نے یہ سب تو کرلیا مگر پوری طرح اپنی محبت ان کے ذہن سے نہ کھرچ سکا۔ مجھے ان کے ذہن میں یہ ساری باتیں بٹھانے میں بڑی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ انسانیت اور شرافت کے نام پر ان کا ذہن میری تجاویز قبول کرنے پر کسی حد تک آمادہ ہوگیا۔ انہوں نے ہوش میں آنے کے بعد کہا۔ ''رنجیتے! ہم کو یہ زندگی قطعی پسند نہیں۔ کب کس کی بیٹی یا بیٹا گولی کا نشانہ بن جائے۔ کچھ نہیں معلوم! تیرا کیا خیال ہے؟ تو نے جو تجویز مجھے بتائی تھی وہ پوری طرح مجھے منظور نہیں۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تجھے پھانسی بھی نہ ہو اور سب معاملہ ٹھیک بھی ہوجائے۔'' بڑی ٹھکرائین پھانسی کا لفظ سن کر چونک پڑیں۔'' کیا بک رہے ہو بڑے ٹھاکر۔ ہوش میں تو ہو۔ پھانسی لگے اس کے دشمنوں کو۔''

مجھے اندازہ تھا کہ ٹھکرائین کا جواب یہی ہوگا۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ ان کے ذہن کو بھی قابو میں کرکے اس بات کے لئے تیار کیا جائے۔ ورنہ وہ اس صدمے کو برداشت نہیں کرپائیں گی۔ میں نے بلاتکلف اپنا کام شروع کردیا۔ بڑے ٹھاکر اس عرصے میں منہ ہاتھ دھونے چلے گئے تھے۔ وہ کچھ کمزور ذہن کی تھیں پوری طرح قابو میں آگئیں۔ لیکن میرے اور شوبھا کے معاملے میں وہ بھی مضبوط ثابت ہوئیں اور جس حد تک بڑے ٹھاکر کا ذہن اس بات پر آمادہ کیا جاسکا تھا کچھ اس سے کم ہی وہ تیار ہوپائیں۔ ماں کی مضبوط محبت کا اندازہ اس وقت مجھے اچھی طرح ہوگیا۔

میں اب جھونپڑے سے نکل کر گرنام سنگھ کے یہاں پہنچا راجکماری مجھے دیکھ کر کھل اٹھی اور خاطر تواضع کرنے لگی۔ میں نے گرنام سنگھ سے کہا۔ ''تمہیں یہ جان کر شاید خوشی ہو کہ میں نے بڑے ٹھاکر اور ٹھکرائین کو کس حد تک اس بات پر آمادہ کرلیا ہے کہ وہ میری جدائی برداشت کرسکیں۔'' گرنام سنگھ کے لئے یہ بات کوئی زیادہ حیرت کی نہیں تھی اسے کسی حد تک میری پراسرار قوتوں کا اندازہ ہوچکا تھا لیکن وہ پوری طرح معاملے کو نہیں جانتا تھا۔ بس اسے یہ خبر تھی کہ سردار، جو چاہیں ہوسکتا ہے۔ اور جو بات جس سے چاہیں منوا سکتے ہیں۔ کس طرح؟ اس سے وہ لاعلم تھا۔ ''اب مسئلہ ہے کہ وادی کے تمام لوگوں کو تم ایک ایک کرکے میرے پاس بھیجو۔ اور ان سے کہو کہ سردار! ہر ایک سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ اس کام کیلئے تم کوئی خالی جھونپڑا منتخب کرسکتے ہو میں چاہتا ہوں کہ آج ہی معاملہ بھی نمٹا دوں۔'' ہم دونوں باہر نکلے میں نے اس سے کہا۔ ''جب تم پورا انتظام کرلو تو مجھے رحمان کے جھونپڑے پر اس کی اطلاع دو۔'' یہ کہہ کر میں اس سے جدا ہوکر رحمان کے جھونپڑے پہنچ گیا۔

رحمان اور ڈسوزا شیو کرنے میں مصروف تھے۔ میرے پہنچتے ہی وہ دونوں خوش ہوگئے۔ میں نے کہنا شروع کیا۔ ''کل صبح تم دونوں میرا خط لے کر جیپ کے ذریعے دارالحکومت روانہ ہوجاؤ گے اور شام تک مجھے یقین ہے کہ تم دونوں واپس آجاؤ گے۔ پھر پرسوں صبح ہمارا قافلہ یہاں سے ہمیشہ کے لئے روانہ ہوجائے گا۔ لیکن تمہیں سب سے پہلے دارالحکومت میں گورنر صاحب سے ملنا ہوگا اور اس

کے بعد کم از کم تین سو آدمیوں کے رہنے کی بہترین جگہ کا انتظام بھی کر کے آؤ گے۔ وہ اس صورت میں جبکہ گورنر صاحب اس بات پر راضی ہو جائیں کہ وہ میرے علاوہ تمام لوگوں کو بری کر دیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ میں تم دونوں کو ایک ذمہ داری اور سونپتا ہوں وہ یہ کہ تم گورنر سے یہ اجازت بھی حاصل کرو گے۔ کہ ان تمام سپاہیوں کو دوبارہ ڈیوٹی پر لیا جائے ان کی پوری تنخواہیں جو باقی ہیں دی جائیں تا کہ یہ اپنی پچھلی کسر پوری کر سکیں اور اپنے بیوی بچوں میں خوشحال زندگی بسر کر سکیں۔ مزید یہ کہ میرے ساتھیوں کو جو بہترین نشانہ باز اور بہادر ہیں پولیس اور فوج میں نوکریاں دی جائیں تا کہ وہ ایک باعزت زندگی گزار سکیں۔ اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ باعزت روزی کما کر پال سکیں۔''

میری اسبابیات سے ڈسوزا اور رحمان دونوں نے پورا اتفاق کیا۔ پھر ڈسوزا پر یقین لہجے میں بولا۔'' سردار! ہم آپ کو یقین دلاتا کہ گورنر صاحب سے ام اپنی بات منوا لے گا۔ وہ امارا وطن کا ہے۔ ہماری بات نہیں ٹالے گا۔ ام یہ بھی کوشش کرے گا کہ وہ آپ کو چھوڑ دے۔''

میں نے ڈسوزا کی بات سنکر کہا۔'' نہیں ڈسوزا! اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ مجھے چھوڑ دیں میں قانون اور انصاف کا مذاق اڑانا نہیں چاہتا۔ اگر یہی ہوتا تو میں یہ زندگی ہی کیوں ترک کرتا۔ تم مجھے یقین دلاؤ کہ تم گورنر سے میرے متعلق قطعی سفارش نہیں کرو گے۔'' میری بات سنکر ڈسوزا غمگین لہجے میں بولا۔'' سردار تم تو ٹھیک کہتا۔'' پھر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔'' پر ہم اس

دل کو کیا کرے۔'' یہ کہتے کہتے اس کا گلا رندھ گیا رحمان بھی اس کی بات سن کر آبدیدہ ہو گیا اور بولا۔'' سردار اور کچھ چاہے ہو نہ ہو۔ میں آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے تمام ساتھیوں کو گورنر صاحب سے معافی دلا دوں گا اور ان کی نوکریاں بھی طے کرا دوں گا۔'' ہم لوگ ابھی یہی باتیں کر رہے تھے کہ گرنام سنگھ آ گیا۔ وہ یہ خبر لے کر آیا تھا کہ اس نے تمام وادی والوں کو میرا حکم پہنچا دیا ہے اور ب وہ میرے منتظر ہیں۔ یہیں دوسری گلی میں اس نے عارضی طور پر ایک نیا جھونپڑا خالی کرا لیا ہے۔

میں اس کے ساتھ اس نئے جھونپڑے تک آیا دیکھا کہ پوری چوڑی گلی وادی والوں سے بھری ہوئی ہے۔ اب میں اپنا کام شروع کرنے والا تھا۔ ایک ایک کر کے لوگ آتے رہے اور میں ان کے ذہنوں کو تبدیل کرتا رہا۔ سامنے کے دروازے سے لوگ داخل ہوتے اور پچھلے دروازے سے میرے حکم پر اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے جہاں انہیں اپنا سامان وغیرہ باندھ کر چلنے کی تیاری کرنی تھی۔ تا کہ کل وہ بقیہ دوسرے کام کر سکیں۔ مثلاً قید خانہ خالی کرانا تھا اسلحہ او تجوریاں باہر نکالنی تھیں۔ جن میں کروڑوں روپیا' سونا اور ہیرے جواہرات بھرے پڑے تھے مجھے یہ کام کرتے کرتے شام ہو گئی۔ اور میں بے حد تھک گیا۔ تمام پاہیوں کو اب اپنی پچھلی زندگی یاد آ چکی تھی لیکن میں نے ان کے ذہن سے اس ندگی کے نقوش نہیں مٹائے تھے۔ اور انہیں سب کچھ یاد تھا۔ ہاں اس میں صرف تنا اضافہ تھا کہ انہوں نے سب کچھ آئی جی اور ڈی آئی جی کی منشا کے مطابق کیا اور

انہیں یہ علم تھا کہ ہم یہاں عارضی طور پر ہیں اور انہیں یہاں سے نکل کر یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ مجبور تھے اور ان پر سخت پابندی تھی اور انہیں وادی سے باہر نکلنے کا راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔ جب بھی کبھی انہیں وادی سے نکالا گیا آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ یہ تمام باتیں ان کے ذہن نشین کردی گئی تھیں تاکہ باہر نکلنے کے بعد خود ان پر یہ الزام نہ لگے کہ انہوں نے بجائے قانون کی مدد کرنے کے قانون شکنی کی اور یہ بھی کہ جن دو ایک ڈاکوں میں وہ شریک ہوئے ان میں ان کی تعداد اتنی کم ہوئی تھی کہ اصل ڈاکو ان پر بھاری رہتے تھے اور ہر طرح انہیں اپنی نگہداشت میں رکھتے تھے اس کے علاوہ آئی جی رحمان اور ڈی آئی جی ڈسوزا کا بھی ان کے لئے یہی حکم تھا کہ وہ بے چون چرا کئے جو کچھ گزر رہا ہے دیکھتے رہیں اور اس میں قطعی مداخلت نہ کریں۔ ان کے ذہن میں یہ بھی میں نے بٹھا دیا کہ انہوں نے کئی دفعہ فرار ہونے کی کوشش کی مگر انہیں راستہ نہیں ملا۔ وہ اگر بقیہ ڈاکوؤں سے لڑ بھڑ کر انہیں مار بھی دیتے تو اس قید خانے سے کس طرح نکلتے۔ اور شاید یہی راز جاننے کے لئے آئی جی رحمان اور ڈی آئی جی ڈسوزا نے سردار رنجیت سنگھ سے دوستی کی تھی تاکہ وہ ہمیں راستے کا علم ہوجانے کے بعد یہاں سے نکال لے جائیں۔ اور یہی ہم سے انہوں نے کہا بھی تھا کہ اس وقت تک ہم کچھ نہیں کرسکتے جب تک خفیہ راستے کا علم نہ ہوجائے۔ کہ وہ کدھر سے ہے اس لئے کہ چاروں طرف بے انتہا اونچی اور سپاٹ پہاڑیاں تھیں۔ ہم بھاگتے بھی تو بھاگ کر کہاں جاتے۔؟''

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں اتنا تھک چکا تھا کہ بمشکل اپنے

ے جھونپڑے تک پہنچ سکا۔ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں اور سر بری رح دکھ رہا تھا۔ جیسے میں برسوں سے نہیں سویا۔ میں اپنے جھونپڑے میں پہنچتے ہی ل دار نرم بستر پر گر کر بے خبر سو گیا۔ صبح میں رحمان اور ڈسوزا کے جگانے پر اٹھا۔ یرے ہی حکم پر شہر روانہ ہو رہے تھے انہوں نے اپنی وردیاں پہنچ لی تھیں اور بغل چھوٹے چھوٹے ڈنڈے دبے ہوئے تھے ان کے سروں پر پی کیپ بہت بھلی رہی تھیں۔ ہولسٹروں میں ان کے ریوالور بھی موجود تھے۔ وہ بہت دن بعد اس وردی میں نظر آئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی وہ خط مجھے دکھایا جس کی اپنی تحریر میں نقل کر کے انہیں دینی تھی۔ میں نے وہ خط اپنے طرزِ تحریر میں جوں وں نقل کردیا۔ یہ خط گورنر کے نام تھا۔ مضمون وہی تھا جو میں نے انہیں بتایا تھا جھونپڑے کے باہر آکر سامنے کھڑی جیپ کو دیکھنے لگا جس میں بیٹھ کر وہ روانہ نے والے تھے۔ ان کے انکار پر بھی ان کیساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ اور جیپ راستے سے ہوتی ہوئی اس گول وادی سے باہر نکل آئی اور پیچھے راستہ خود بہ خود ہوگیا۔ میں نے ان دونوں کو گلے سے لگایا اور رخصت کیا اور اس وقت تک ں کھڑا رہا جب تک کہ جیب اونچے نیچے راستوں پر آگے بڑھتی ہوئی میری ھوں سے اوجھل نہ ہوگئی۔



گول وادی میں شام دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ ہم سب رحمان
اور ڈی سوزا کے منتظر تھے۔ جو صبح گورنر سے ملنے گئے تھے۔ ان کی واپسی پر اس
وادی کے لوگوں کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ تمام انتظامات مکمل ہو چکے
تھے۔ قید خانہ خالی ہو چکا تھا' تمام اسلحہ بڑے میدان میں ڈھیر تھا' اس کے علاوہ
وادی کے لوگوں کے پاس جتنی دولت تھی وہ بھی صندوقوں میں بھری ہوئی کھلے
میدان میں رکھی ہوئی تھی بڑے ٹھاکر اس تمام سامان کے پاس بنے ہوئے
چبوترے پر بڑی شان سے بیٹھے تھے اور وادی کے لوگ صف بہ صف میدان میں
بیٹھے ہوئے رحمان اور ڈی سوزا کا انتظار کر رہے تھے۔ رحمان کے ساتھی پولیس
والے اپنی اپنی وردیوں میں ملبوس تھے، انہیں پچھلی زندگی پوری طرح یاد آ چکی تھی
اور اب وہ اپنے بیوی بچوں اور گھر والوں سے ملنے کیلئے بیتاب تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک جیپ چبوترے کے پاس آ کر رکی' اس میں سے
رحمان اور ڈی سوزا باہر نکلے، لوگوں نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا کیونکہ لوگ

گورنر کا فیصلہ سننے کے لئے بے تاب تھے‘ وہ دونوں میرے قریب آئے اور رحمان میرے گلے سے لگ گیا، اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ میرے چبوترے پر چڑھ جائے۔ اور وادی کے لوگوں کو گورنر کے فیصلے سے بہ آواز بلند آگاہ کردے۔ رحمان نے بتایا کہ گورنر صاحب نے وہ تمام شرائط منظور کرلی ہیں جو تمہارے سردار نے (یعنی میں نے) گورنر کے نام اپنے خط میں تحریر کی تھیں لیکن اس کی صرف ایک ہی شرط ہے اور وہ یہ کہ تمہارا سردار اپنے آپ کو غیر مشروط طور پر حکومت کے حوالے کردے اور تمہارا سردار یہ شرط پوری کرنے کے لئے بخوشی تیار ہے۔

یہ سن کر لوگوں کی اس خوشی پر اوس پڑ گئی جو انہیں اپنے معاف کئے جانے پر ہوئی تھی۔ لوگوں نے اس بات پر شور مچانا شروع کردیا تو میں نے رحمان کو چپ ہونے کا اشارہ کیا اور پھر خود چبوترے پر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو یقین دلایا کہ ایک شخص کی جان ہزاروں انسانوں کی جان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اور یہ بات ان سب کے مفاد میں ہے کہ میں خود کو حکومت کے حوالے کردوں۔ میں نے بہت محبت اور شفقت کے ساتھ ان لوگوں کو تمام باتیں سمجھائیں اور یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ وہ لوگ جلد ہی میری بات سمجھ گئے۔

دوسری صبح ہم سب نے گول وادی کو الوداع کہا‘ ہمارا قافلہ وادی سے نکل کر اونچے نیچے پتھریلے راستوں پر آگے بڑھنے لگا‘ ایک زندگی ختم ہو رہی تھی اور دوسری ہمیں اپنی طرف بلا رہی تھی پولیس کے ٹرک سب سے آگے تھے جن کے

پیچھے گھوڑوں کی قطاریں تھیں اور ان کے بعد قافلے میں شامل عورتیں‘ بچے اور بوڑھے تھے‘ ہمارا قافلہ جب شہر میں داخل ہوا تو اسے دیکھنے کے لئے لوگوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے ان لوگوں کو شاید یہ معلوم ہو چکا تھا کہ مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ نے اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو اپنی مرضی سے قانون کے حوالے کردیا ہے آخر کار ہمارا قافلہ ایک بڑے سے میدان میں پہنچ کر رک گیا جس کے دائیں جانب کوارٹروں کی قطاریں بنی ہوئی تھیں‘ تمام لوگ سواریوں سے اتر اتر کر ان کوارٹروں میں منتقل ہوگئے اور ان کا ساز و سامان بھی‘ نوٹوں سے بھری ہوئی تجوریاں زیورات اور جواہر سے بھرے ہوئے صندوق سرکاری خزانے میں پہنچا دیئے گئے۔

یہ تمام کارروائی میرے سامنے ہوئی‘ شاید رحمان یہ چاہتا تھا کہ میں اپنی آنکھوں سے اپنے وفادار ساتھیوں کو بہتر مکانوں میں منتقل ہوتے ہوئے دیکھ لوں‘ اب میرے جیل منتقل ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ میرے سامنے بڑے ٹھاکر‘ ٹھکرائن‘ گرنام سنگھ‘ رام سروپ اور چرنجی کھڑے تھے‘ ان سب کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میرا دل بھی رو رہا تھا۔ میں ان سب سے آخری بار گلے ملا اور پھر رحمان اور ڈی سوزا کیساتھ جیپ میں بیٹھ کر سنٹرل جیل کی طرف روانہ ہوگیا۔

راستے میں رحمان نے مجھے بتایا کہ قانون کی رو سے حکومت مجھ پر مقدمہ چلائے گی اور اس کے لئے اس نے ایک عمدہ وکیل کا انتظام کرلیا ہے جو میری طرف سے صفائی پیش کرے گا اور میرا مقدمہ لڑے گا۔ میں نے اس سے کہا بھی

کہ یہ سب بیکار کی بات ہے میں اپنے بارے میں تمام اعترافات کر چکا ہوں' اب اس ڈھونگ ڈھکوسلے کی قطعاً ضرورت نہیں رہی۔ لیکن رحمان اور ڈی سوزا نے بتایا کہ مقدمہ تو ضرور چلے گا۔ اس سے مفر نہیں...... ادھر اور عدالت جو فیصلہ سنائے گی۔ ہم سب کو اس کا پابند ہونا پڑے گا۔

جیل پہنچ کر رحمان نے میرا تعارف بطور خاص جیلر ولیم برٹ سے کرایا اور اسے ہدایت دی کہ چونکہ میں نے خود ہی اپنے آپ کو قانون کے حوالے کیا ہے' اس لئے میرے ساتھ خصوصی رعایت برتی جائے۔

اس دن میرے مقدمے کی پہلی پیشی تھی۔ عدالت میں میری ملاقات ملک کے ذہین اور مشہور وکیل فضل الرحمٰن سے ہوئی...... رحمان نے اس وکیل کو میرا مقدمہ لڑنے کے لئے ذاتی طور پر تیار کیا تھا۔

مقدمے کی باضابطہ کارروائی شروع ہوئی۔ وکیل سرکار جو ایک عمر رسیدہ شخص تھا اپنی عینک درست کرتا ہوا اس کٹہرے کے قریب آیا جہاں میں کھڑا تھا۔ پھر اس نے با آواز بلند سوال کیا۔

''ڈاکو رنجیت سنگھ ولد ڈاکو بلبیر سنگھ کیا تمہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ تم نے ہزاروں افراد کو لوٹا اور سینکڑوں افراد کو قتل کیا۔؟'' وکیل سرکار کی ناگوار اور کرخت آواز رکنے کے بعد میں نے بلند آواز میں اقبال جرم کر لیا۔ میرے اقبال جرم کے بعد پھر اس کی آواز کمرہ عدالت میں گونجی۔ ''یو آنر! مجرم اقبال جرم کر چکا ہے' میں اس بارے میں عدالت سے اجازت چاہوں گا کہ اس کیس کو مزید

مضبوط کرنے کیلئے میں گواہوں کو پیش کر سکوں۔''

عدالت نے اجازت دے دی اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ میرے خلاف گواہی دینے والوں میں سب سے پہلا نام آئی جی رحمان کا تھا لیکن میرے گواہ میرے خلاف کب تھے؟ یہ سب کچھ تو میری مرضی کے عین مطابق ہو رہا تھا، آئی جی رحمان نے حلف اٹھایا' اس کے بعد اس سے متعدد سوالات کئے گئے جن کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ میں نے متعدد قتل کئے ہیں' ڈاکے ڈالے ہیں اور امیروں کے لئے عذاب الٰہی بنا رہا ہوں رحمان کے بعد ڈیسوزا اور دوسرے گواہوں کو پیش کیا گیا۔ میں نہایت بے دلی کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ سب سے آخر میں وکیل سرکار نے عدالت کو وہ خط پڑھ کر سنایا جو میں نے گورنر کے نام تحریر کیا تھا اور جس میں میں نے اپیل کی تھی کہ ان گناہوں کی پاداش کے طور پر مجھے پھانسی دے دی جائے۔

اس کے بعد مکروہ آواز میں سرکاری وکیل بولا۔ ''یو آنر! اس تمام کھڑاک کا مقصد اچھی طرح سمجھتے ہوں گے کہ مجرم نے اتنی آسانی سے اقبال جرم کیوں کر لیا ؟ جب کہ وہ ایک بدنام زمانہ ڈاکو اور قاتل ہے۔ اس نے گورنر صاحب کو ایسا خط کیوں لکھا' یقیناً ان تمام باتوں سے یہ چالاک مجرم حکومت اور انصاف کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

مجھے اس خبیث صورت وکیل سرکار کی یہ بات نہایت ناگوار گزری' اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا میرا وکیل جو خاموشی سے بیٹھ گیا تھا اٹھ کھڑا ہوا اور تیز آواز

میں بولا۔ پوائنٹ آف آرڈر' یور آنر! وکیل سرکار کو یہ حق نہیں کہ وہ میرے موکل
دیانت اور سچائی پر حملہ کریں میں اس بات پر سخت احتجاج کرتا ہوں جب کہ میر
موکل خود اقبال جرم کر چکا ہے اور وہ عدالت سے رحم کا طالب بھی نہیں تو اس کی نی
پر اس طرح حملہ کرنا شرافت و سچائی کے خلاف ہے میں معزز عدالت کی وساطت
سے وکیل سرکار سے کہوں گا اور پر زور الفاظ میں کہوں گا کہ وہ اپنے الفاظ واپس
لیں۔'' اور اس سے پہلے کہ ججوں میں سے کوئی کچھ کہتا' وکیل سرکار نے اٹھ کر اپنے
الفاظ واپس لے لئے۔ مجھے اس نوجوان وکیل کی یہ ادا بہت بھائی اس کی آواز میں
ایک عجیب مٹھاس سی تھی۔ میں اس سے اور اس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا
بھولا سا معصوم چہرہ' گورا رنگ' بالائی ہونٹوں پر چھوٹی چھوٹی باریک مونچھیں' سرخ
اور تازہ ہونٹ رخساروں پر غالباً روزانہ شیو کرنے کے سبب ہلکی سی نیلاہٹ' کالے
کالے بڑے بال' اس کے ریشم کی طرح ملائم بال بار بار اس کی چوڑی پیشانی پر
گر پڑتے اور وہ ایک خفیف سے جھٹکے سے انہیں پیچھے کر دیتا۔ اس کی ہر ادا خوب تھی
قد دراز تھا آنکھیں بھی روشن اور بڑی بڑی تھیں۔ جسم صحت مند تھا مگر موٹا پا نہیں
تھا۔

میں ابھی ابھی ان خیالوں میں گم تھا کہ عدالت برخواست کر دی گئی۔
واپسی میں، میں نے ایڈووکیٹ فضل الرحمٰن کے بارے میں آئی جی رحمان سے
بہت کچھ پوچھا۔'' وہ کہاں رہتا ہے' شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ' اس کی دیگر
مصروفیات کیا ہیں' اس کے کتنے بھائی بہن ہیں وغیرہ وغیرہ۔ میری اس پوچھ گچھ

سے آئی جی رحمان حیران ہوا' میں نے کہا کوئی خاص بات نہیں وہ مجھے اچھا لگا اس
لئے پوچھا تھا۔

مجھے اس کے بارے میں آئی جی رحمان سے معلوم ہوا کہ وہ ایک معزز
خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور ایک ریٹائرڈ کرنل کی واحد اولاد ہے۔ عنقریب ہی
اس کی شادی ہونے والی ہے' وہ اپنے باپ اور ماں کے ساتھ سادات نگر میں رہتا
ہے۔

میں نہ جانے کن خیالات میں کھویا رہا اور نہ جانے کب رحمان مجھ سے
رخصت ہو کر چلا گیا۔ دوسری پیشی دوسرے دن تھی میں گھنٹوں ایڈووکیٹ فضل
الرحمٰن کے تصور میں کھویا رہا۔ میں خود بھی حیران تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ مگر کچھ
سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔ آخر کار تھک ہار کر میں بستر پر گر گیا اور تھوڑی دیر ہی میں
سو گیا۔

دوسری صبح جیلر ولیم برٹ نے مجھے مطلع کیا کہ مجھ سے کچھ لوگ ملنے کے
خواہش مند ہیں میں نے ملاقاتیوں کے کمرے میں آ کر دیکھا یہ بڑے ٹھاکر'
ٹھکرائن' گرنام سنگھ' رام سروپ اور چرنجی تھے' مجھے گرنام ' چرنجی اور رام سروپ
بہت اچھے لگے اس لئے کہ وہ تینوں اس وقت پولیس کی وردیوں میں ملبوس تھے۔
ان سے معلوم ہوا کہ بقیہ لوگ بھی مجھ سے ملاقات کے خواہش مند ہیں ' اجازت
ملنے کے بعد وہ مجھ سے ملیں گے۔ بڑے ٹھاکر اور ٹھکرائن کے علاوہ سبھی میرے لئے
فکر مند تھے۔ میں نے گرنام سنگھ سے پوچھا'' کہو شہر کیسا لگا' تم خوش تو ہو؟'' وہ

ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''ہماری خوشی آپ کے بغیر ادھوری ہے۔لیکن بہر حال ہم یہاں آکر بہت مطمئن ہیں۔اور بھگوان نے کیا تو آپ کے نام کو داغ نہ لگنے دیں گے۔میری ڈیوٹی کسٹم پر ہے۔کل ہی میں نے ایک رشوت خور افسر کو پکڑوایا ہے۔''

میں نے یہ سن کر اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا۔''مجھے تم لوگوں پر فخر ہے' اسی طرح ملک وقوم کی خدمت کرتے رہو' اسی میں تمہاری اور سب کی بھلائی ہے۔اس کے بعد میں کچھ دیر تک بڑے ٹھاکر اور دوسرے لوگوں سے باتیں کرتا رہا اور انہیں......تسلیاں دیتا رہا'' کہ مجھے ہر طرح آرام ہے' تم لوگ قطعی میری فکر نہ کرو۔'' وہ سب تھوڑی دیر اور میرے پاس بیٹھے کر چلے گئے۔

آج عدالت میں میرے موکل کے بولنے کی باری تھی۔وہ اپنی نشست سے اٹھا اور اس نے کہا شروع کیا۔یور آنر! مجھے اپنے موکل کی تائید میں زیادہ لمبی تقریر نہیں کرنی۔سوائے اس کے کہ فاضل عدالت میرے موکل کے اقبال جرم کو مدنظر رکھے کہ اس نے بغیر کسی دباؤ یا جبر کے اقبال جرم کر لیا۔دوسرے یہ کہ اس نے اپنی پچھلی زندگی کسی خوف' قانون اور پولیس کے ڈر یا کسی سازش کے تحت ترک نہیں کی' بلکہ اس نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ کر قانون اور انصاف کا ساتھ دیا ہے۔اور نہ صرف یہ بلکہ اس نے اپنے سینکڑوں ساتھیوں کو بھی قانون کا احترام کرنے پر مجبور کیا ہے۔

اس شخص نے جو بہت قاتل اور ڈاکو مشہور ہے ہماری پولیس اور اس کے

اعلیٰ حکام کے ساتھ کیا' بے مثال رویہ رکھا اس کا زندہ ثبوت خود آئی جی رحمان اور ڈی آئی جی ڈی سوزا اور سینکڑوں پولیس کے جوان ہیں' وہ قانون اور انصاف کے ساتھی ہوتے ہوئے بھی اس شخص کی دیانت' اخلاق اور صداقت کی قسم کھا سکتے ہیں۔میں اپنا کوئی گواہ نہیں پیش کروں گا۔اس لئے کہ میرے وکیل سرکار نے جو گواہ پیش کیئے وہی گواہ میرے بھی تھے جنہوں نے اپنے بیانات میں صاف صاف رنجیت سنگھ کی سچائی اور بڑائی کا اعتراف کیا ہے' آخر میں، میں معزز عدالت سے اپنے موکل رنجیت سنگھ کے لئے رحم کی اپیل کرتا ہوں۔اور درخواست کرتا ہوں کہ معزز عدالت اسے باعزت بری کر دے تا کہ دوسرے قانون شکن ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ لوگوں کی ہمت بھی بڑھے اور وہ بھی اپنے آپ کو قانون وانصاف کے حوالے کرتے ہوئے نہ ڈریں اس سے ملک میں ایک اچھی مثال قائم ہوگی۔''

مجھے اس نوجوان کی جرح سن کر ایک عجیب زندگی کا سا احساس ہوا پھر یہ کہ اتنے دن گزر جانے کے بعد مجھے زندگی سے کچھ لگاؤ محسوس ہونے لگا تھا۔اور میں تنہائی میں سوچتا تھا، کہ ابھی میرے مرنے کے دن نہیں ہیں اور آج تو اس نوجوان کی پرزور باتیں سن کر جیسے زندگی مجھ میں لوٹ آئی۔عدالت پھر کل تک کے لئے برخاست کر دی گئی کل فیصلے کا دن تھا۔

کل بھی آ گئی مگر مجھے رات نیند نہ آئی اور اٹھ اٹھ کر ٹہلتا رہا...... ولیم برٹ کئی دفعہ اس عرصے میں میرے پاس آیا وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں لطیفے سنا سنا کر میرا جی بہلا رہا تھا، میں رات بھر جاگا اور صبح اس وقت میری آنکھ ذرا لگی جب

جیل کا گھنٹہ **5** بجا رہا تھا۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب آئی جی رحمان نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا اور کہا۔ ''میں تو سمجھا کہ آپ تیار ملیں گے مگر ولیم سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ رات بھر سو نہیں سکے۔ آخر آپ اتنے فکر مند کیوں ہیں۔ خدا نے چاہا تو آپ صاف بری ہوں گے۔''

میں عدالت پہنچا' سامنے بیٹھے ہوئے بڑے ٹھاکر اور گرنام سنگھ وغیرہ ملول نظر آرہے تھے' آخر میں نے انکے ساتھ اتنے دن گزارے تھے' ایڈووکیٹ فضل الرحمٰن آج بھی تر و تازہ تھا۔ وکیل سرکار حسب معمول اپنی عینک بار بار اپنی ناک پر جما رہا تھا۔ آخر کار فیصلہ سنانے کا وقت آ گیا۔ بڑے جج نے ایک مرتبہ اپنی چکنی کھوپڑی پر ہاتھ پھیرا اور ذرا کھکھار کر گلا صاف کیا' پھر اس کی باریک سی آواز نکلی۔

''مجرم رنجیت سنگھ نے جس ہمت و جرات اور قربانی کا ثبوت دیا ہے' عدالت اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس نے پولیس اور پولیس کے اعلیٰ حکام کے ساتھ جو سلوک اور رویہ اپنی پناہ گاہ میں روا رکھا عدالت اس کے لئے مجرم کی شکر گزار ہے۔ مجرم نے حکومت کی نظر میں پولیس کی پوزیشن جس طرح واضح اور صاف کر دی وہ بھی مجرم کا قابل داد عمل ہے مجرم نے جس طرح اپنے ساتھیوں کی ذہنیت بدل کر انہیں ایک ذمہ دار اور پر امن شہری میں تبدیل کر دیا یہ بھی اس کا ایک قابل فخر کارنامہ ہے مجرم نے سرکاری خزانے میں جو اضافہ کیا اور جس دیانت کا ثبوت دیا۔ حکومت اس کے لئے مجرم کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ مجرم

نے بغیر کسی دباؤ کے اپنے آپ کو جس طرح قانون کے سپرد کر کے اقبال جرم کیا وہ ایک مثال اور یادگار کارنامہ ہے۔ عدالت اس باب میں بھی مجرم کو قابل تقلید اور مثالی سمجھتی ہے لیکن قانون ہر حال میں قانون ہے' اس لئے یہ عدالت کافی غور و خوص کے بعد اور مجرم کے ساتھ خاص رعایت اور اس کے کارناموں کو مدنظر رکھتے ہوئے مجرم کو بجائے سزائے موت کے عمر قید کی سزا دیتی ہے۔''

میں نے دیکھا کہ میرے سامنے بیٹھے بڑے ٹھاکر اور گرنام سنگھ وغیرہ کے کے چہرے ایک لمحے کے لئے کھل اٹھے لیکن رات میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ ایک عجیب و غریب فیصلہ اور وہ یہ کہ کسی بھی حالت میں نہ ابھی مجھے مرنا ہے نہ جیل میں عمر گزارنی ہے۔ میں نے ایک لمحے کچھ سوچا اور چیخ کر بولا' مگر مجھے عدالت کا یہ فیصلہ منظور نہیں۔''

میری آواز سن کر سب لوگ حیرت میں رہ گئے اور جج' آرڈر آرڈر کہہ کر بولا۔ عدالت برخاست کی جاتی ہے۔''

اور اس سے پہلے کہ وہ لوگ اٹھتے کمرہ عدالت ''جے درگا مائی'' کے نعرے سے گونج اٹھا سامنے کھڑے ہوئے نوجوان وکیل کے جسم کو اس کے ساتھ ہی ایک جھٹکا سا لگا' اور ساتھ ہی مجھے بھی عدالت میں ہلچل مچ گئی اور اٹھ کر جاتے ہوئے جج ایک لمحے کے لئے ٹھہر گئے ان کے سامنے مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ کا مردہ جسم کٹہرے میں پڑا تھا۔ میں یعنی علی حسن اب نوجوان ایڈووکیٹ فضل الرحمٰن کے جسم میں داخل ہو چکا تھا اور سامنے ہی کٹہرے میں وہ جسم پڑا تھا' جس میں ابھی ایک

لمحے پہلے میں تھا۔ مجھے بالکل ایسا لگا جیسے میں نے کپڑے تبدیل کر لئے ہوں۔ اور پرانا جسم اتار پھینکا ہے۔

بڑے ٹھاکر ''رنجیتے'' کہہ کر چیخ پڑے۔ ''کیا ہوا میرے بیٹے کو۔'' وہ اور گرنام سنگھ وغیرہ بھی ششدر رہ گئے تھے کہ ابھی کچھ دیر پہلے تو رنجیت سنگھ ٹھیک تھا آخر یہ ایک دم کیا ہوا؟ بڑے ٹھاکر زار وقطار رو رہے تھے اور میں جو اس وقت فضل الرحمٰن بن چکا تھا، ان کے پاس کھڑا ہوا انہیں تسلیاں دے رہا تھا' آئی جی رحمان اور ڈی آئی جی ڈسوزا بھی یہ منظر دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ یہ دیکھ کر میں بھی لاش کے قریب پہنچ گیا آج میں نے پہلی بار پوری طرح اپنے سابق جسم کو اس سے علیحدہ ہو کر دیکھا تھا۔ تقریباً چھ ساڑھے چھ فٹ کا جوان' چوڑا چکلا سینہ' بھرے بھرے بازو' چہرہ رعب دار' بڑی بڑی مونچھیں' سانولا رنگ' آنکھیں بند تھیں جیسے ابھی نیند آ گئی ہو۔ جج اٹھ چکے تھے لاش طبی معائنے کے لئے ہسپتال روانہ کر دی گئی۔

اسی پہر میں اپنے ہی جسم کو کاندھا دے رہا تھا ہر چند کہ میں بہت مصروف وکیل تھا' مگر اس جنازے میں ضرور شریک ہوا اور اپنے تمام موکلوں کو واپس کر دیا' یہ دیکھ کر آئی جی رحمان اور ڈسوزا نے میرا بہت شکریہ ادا کیا اور میں نے اخلاق برتتے ہوئے کہا۔ ''نہیں یہ تو میرا فرض تھا۔'' مجھے رحمان ہی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ''ڈاکٹری رپورٹ یہ ہے کہ سردار رنجیت سنگھ کی موت حرکت قلب بند ہو جانے سے ہوئی ہے۔'' مجھے کیونکہ بڑے ٹھاکر اور گرنام سنگھ وغیرہ سے اپنی پچھلی زندگی کے

سبب بہت محبت تھی، اس لئے میں کافی دیر ان لوگوں کو دلاسے اور تسلیاں دیتا رہا اور سمجھاتا رہا۔ ٹھکرائن کا برا حال تھا۔ وہ کئی دفعہ بے ہوش ہوئیں اور ہر مرتبہ انہوں نے رو رو کر پھر اپنی طبیعت خراب کر لی ہر چند کہ رنجیت سنگھ ان کی اولاد نہ تھا۔ مگر اسے انہوں نے بچپن سے اولاد کی طرح پالا تھا۔ اس لئے ایک ماں کو جو محبت اپنے سگے بیٹے سے ہو سکتی ہے وہی انہیں رنجیت سنگھ سے تھی اور اس کی جوان موت ان کے لئے ایک جانکاہ صدمہ تھی۔

میں ان لوگوں سے رخصت ہو کر باہر نکلا کئی لوگوں نے مجھے سلام کیا اور میں ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا' سامنے سے ایک ٹیکسی آ رہی تھی۔ میں نے اسے ہاتھ دے کر روکا اور اس میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی والے کو میں نے صدر بازار کا پتا بتا دیا اور تھوڑی ہی دیر بعد میں صدر کے چوک میں کھڑا تھا۔

میں نے جیل میں قید تنہائی کے جو چند دن گزارے تھے ان دنوں میں میری فطرت ایک بار پھر ابھر آئی تھی اور عورت ایک بار پھر میرے ذہن پر مسلط ہو چکی تھی۔

میں فٹ پاتھ پر کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ سامنے سے ایک نوجوان جوڑا آ رہا تھا لڑکی بہت حسین تھی اور لڑکا بھی کچھ کم خوبرو نہ تھا۔ میں نے آہستہ سے ''درگاہ مائی کی جے'' کا نعرہ مارا اور دوسرے ہی لمحے فضل الرحمٰن ایڈووکیٹ کا بدن زمین پر پڑا تھا اور میں اس لڑکے کے بدن میں داخل ہو چکا تھا۔

اس لڑکی کے ساتھ میں نے چند بہت خوبصورت دن گزارے اور جب

اس سے میرا دل بھر گیا تو میں ایک بار پھر اپنے شکار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اس دن کے بعد سے اب یہ میرا شغل ہو گیا کہ میں کسی بھی جسم میں ایک دو دن یا رات بھر سے زیادہ نہ گزارتا، میں دیکھتا کہ کوئی جوان جوڑا جا رہا ہے اور میں فوراً اس نوجوان کے جسم میں داخل ہو جاتا جو کسی جوان لڑکی کا ہاتھ تھامے ہوئے جا رہا ہوتا۔ رات بھر اور کبھی کبھار دو چار دن میں اس لڑکی کے ساتھ راتیں بسر کرتا' پھر پھر کسی صبح وہاں سے کسی اور جسم میں منتقل ہو جاتا۔ شہر میں روزانہ کسی نہ کسی نئے شادی شدہ لڑکے کی جوان موت ہو جاتی رفتہ رفتہ یہ بات مشہور ہونے لگی کہ نئے شادی شدہ جوڑوں کے لئے خاص خطرہ ہے۔ ایک انجانا خطرہ نہ معلوم کب کوئی نوجوان اپنی نئی دلہن کے پہلو میں مردہ پایا جائے میں یہ کرتا کہ رات بھر کسی جسم میں رہ کر اسکی بیوی سے جنسی تسکین حاصل کرتا اور صبح ہوتے ہی وہ جسم چھوڑ کر کسی قریبی جسم میں منتقل ہو جاتا ہوا وہاں سے دور نکل جاتا۔

برسوں میرا یہی شغل رہا ایک شہر سے دوسرے شہر پھر تیسرے شہر دن رات میرا یہی مشغلہ تھا جسم بدلنا اب میرے لئے ایک دلچسپی اور کھیل سا تھا۔ جسم میرے لئے بالکل کپڑوں کی طرح تھے جب چاہتا کوئی بھی جسم اتار پھینکتا۔ مگر انسانی طبعیت کسی اور ہی خمیر کی بنی ہے۔ کسی ایک طرح کے عمل میں اسے کبھی سکون نہیں ملتا۔ میرے دل میں ایک بار پھر اس زندگی سے نفرت سی پیدا ہونے لگی۔ مجھے کسی صورت قرار نہ تھا۔ اب مجھے ان ماؤں کی آہیں بھی سنائی دینے لگیں جن کے جوان بیٹوں کو مار کر میں ان کے جسموں پر قبضہ کر لیتا تھا اور صبح ہوتے ہی پھر انہیں مردہ

حالت میں اجاڑ دیتا تھا۔ میرے دل میں خوف خدا پیدا ہونے لگا۔

میں اس وقت ایک ہندو کے جسم میں تھا اس لئے جب لوگوں نے مجھے نماز پڑھتے اور مسجد میں جاتے دیکھا تو ہنگامہ کھڑا ہو گیا میں نے اسی دن یہ جسم چھوڑ کر ایک مسلمان لڑکے کا جسم اپنا لیا، اس لڑکے کی عمر مشکل سے پندرہ سال تھی یہ مسجد کے پیش امام کا لڑکا شاکر تھا میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اس طرح با قاعدہ نماز پڑھنا شروع کر دی اور ہندو دھرم کو قطعی ترک کر دیا تو مجھ سے تمام پراسرار قوتیں چھن جائیں گی مگر میں اب اس پر بھی تیار تھا۔ میں اپنے موجود جسم سے ہر طرح مطمئن تھا۔ یہ لڑکا جس کا نام شاکر تھا اور جس کے جسم میں اس وقت میں تھا۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والد پیش امام الٰہی بخش غریب آدمی نہیں تھے جس کے سبب پیش امام کے فرائض ادا کر رہے ہوں بلکہ انہیں محلے والوں نے بحیثیت بزرگ ہونے کے یہ منصب عطا کیا تھا، وہ بڑے خدا ترس آدمی تھے، ان کے چھ لڑکے تھے، جن میں سب سے چھوٹا میرا موجودہ جسم تھا۔ میرے بقیہ پانچوں بھائی اور ماں باپ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ میرے تین بڑے بھائی شادی شدہ تھے دو غیر شادی شدہ تھے۔ مگر وہ دونوں بھی مجھ سے بڑے تھے یہ سب بھائی ایک ساتھ رہتے تھے، ان میں آپس میں بہت محبت تھی۔ ان لوگوں کا اپنا کاروبار تھا اس میں سب بھائی شریک تھے۔ میں اور مجھ سے دو بڑے بھائی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ تین بھائی جو سب سے بڑے تھے کاروبار سنبھالتے تھے۔ پیش امام الٰہی بخش یعنی میرے موجودہ جسم کے والد ہر وقت یاد الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔

میں اب محنت سے پڑھتا پانچوں وقت بارگاہ ایزدی میں حاضری دیتا اور ہر وقت میرا دل خوف خدا سے لرزتا رہتا، میں اپنے سابقہ بے شمار گناہوں کی معافی اللہ سے مانگتا، ایک صبح فجر کی نماز ادا کر کے جب میں گھر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ راستے میں مجھے ایک کوڑھی ملا اور یہ کوڑھی میرا یہی موجودہ جسم تھا۔ مرلی دھر میں نے دیکھا کہ اس کا گوشت جگہ جگہ سے گل رہا ہے اور وہ نزع کے عالم میں ہے۔ مجھے اسے دیکھ کر بے حد ترس آیا اور میں نے سوچا کہ اگر یہ مرجائے تو اس عذاب سے رہائی ملے اب میں روز نماز پڑھ کر صبح صبح اس کے پاس ضرور ہو کر جاتا۔ اس نے مجھے اپنا نام بھی بتایا اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ وہ ہر وقت اپنے مرنے کی دعا مانگتا مگر اسے نہ موت آتی تھی نہ آئی۔ آخر کار ایک دن میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ اسے اس عذاب سے رہائی دلا دوں گا۔ یہ میرے بس میں تھا ابھی میری پراسرار قوتیں مجھ میں موجود تھی۔ میں نے سوچا کہ میرا کیا ہے مجھے موت تو ہے نہیں میں اس کے جسم میں داخل ہو کر اس کا جسم فوراً ہی چھوڑ کر کسی اور جسم میں پناہ لے لوں گا۔''

''کنور...... وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتا جب میں فجر کی نماز پڑھ کر اس کوڑھی کے پاس آیا اور ''جے درگا مائی'' کا نعرہ لگا کر اس کے جسم میں داخل ہو گیا۔ شاکر کا جسم میرے سامنے مردہ پڑا تھا۔ اب جو میں نے ایک نوجوان کو ادھر سے گزرتے دیکھ کر یہ جسم چھوڑنے کا ارادہ کر کے ''جے درگا مائی'' کا نعرہ مارا تو میری عقل ایک دم گم ہو گئی میرے کوڑھی جسم کو ایک جھٹکا سا تو ضرور لگا مگر میں اسے

چھوڑ نہ سکا۔ میری تمام قوتیں سلب ہو چکی تھیں میں بہت اذیت میں تھا میں بہت گھبرایا رویا پیٹا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب میرے بس میں کچھ بھی نہ تھا۔ میں اب پنے قریب جس کو بھی دیکھتا ''جے درگاہ مائی'' کا نعرہ لگاتا اور سوچتا کہ شاید اب یں کسی دوسرے جسم میں منتقل ہو سکوں۔ لوگ مجھے ''پاگل کوڑھی'' کہنے لگے ''درگاہ ائی'' نے میری ساری قوتیں سلب کر لی ہیں۔ یہ اب میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ محلے کے لوگوں میں سوائے پیش امام بخش کے مجھ سے کوئی بھی ہمدردی نہیں سے پیش ہ آتا۔

انہوں نے ایک دن میرے پاس ٹھہر کر مجھ سے کہا ''مرلی دھر! یہاں ے بیس میل پر کوئی بڑے بزرگ پیر صاحب چونڈیرے شریف کا مزار ہے ہے س طرح ہو سکے وہاں تک پہنچ جاؤ انشاء اللہ تم وہاں دعا کرنے کے بعد اس وذی مرض سے نجات پا جاؤ گے۔''

میں نے جو پیر صاحب چونڈیرے شریف کا نام سنا تو مجھے ایک دم اپنے دا پنڈت گنگا پرشاد اور پیر صاحب کے معرکے یاد آ گئے میں نے دل میں سوچا کہ ینا پیش امام صاحب سچ کہہ رہے ہیں، میں وہاں سے چل دیا مگر کنور تمہارے قصبے ے قریب پہنچتے پہنچتے میری طاقت جواب دے گئی میں یہاں گھسٹ گھسٹ کر جس لیف اور مصیبت سے پہنچ پایا ہوں وہ میں ہی جانتا ہوں' مگر اب اس سے آگے نے اور مزار شریف تک پہنچنے کی طاقت میں خود میں نہیں پاتا۔ ہر چند کہ میں ھے سے زیادہ فاصلہ طے کر چکا ہوں' اگر تم یہاں مجھ سے نہ ملتے اور روز میری

دلجوئی نہ کرتے ۔ میرے کھانے پینے کا انتظام نہ کرتے تو اب تک میں ان گدھوں کی خوراک بن چکا ہوتا جو اپنی چمکیلی آنکھوں سے کئی دن سے میرے مرنے کے منتظر ہیں۔''

بھائی شمیم، مرلی دھر کی پوری کہانی سننے کے بعد میں نے ایک ترکیب اسے اس مصیبت سے نکالنے کے لئے سوچ ہی لی۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنی بڑائی ہانک رہا ہوں، میں نے فیصلہ کیا کہ میں اسے مزار شریف تک ضرور پہنچاؤں گا۔ اس غرض سے میں نے اس کیلئے ایک لکڑی کی گاڑی بنوائی جس میں، میں نے اسے بمشکل ڈالا اور ایک صبح خود اس کی گاڑی دھکیلتا ہوا اللہ کا نام لے کر چل دیا، شام سے پہلے ہی میں مزار شریف تک پہنچ گیا، اب جو اس کوڑھی نے گڑگڑا کر اور رو رو کر دعا مانگی تو شاید تم یقین نہ کرو کہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک خوبصورت جسم میں تبدیل ہو گیا، اس وقت مزار شریف کے گرد دوسرے لوگ بھی دعا مانگنے میں مصروف تھے، اس کوڑھی کے ذرا قریب ہی ایک برقعہ پوش خاتون اور ایک سفید ریش شخص بھی دعا مانگنے میں مصروف تھے وہ سفید ریش شخص بھی دعا مانگتے مانگتے رونے لگا تھا، آنسوؤں سے اس کی داڑھی تر ہو رہی تھی اس سفید ریش شخص نے جیسے ہی دعا مانگ کر اپنے بائیں طرف دیکھا وہ بے ساختہ اس برقعہ پوش خاتون کا کاندھا پکڑ کر چیخ پڑا۔

''زرینہ! خدا نے ہماری دعا سن لی، یہ دیکھو ہمارا بیٹا علی حسن یہاں دعا مانگ رہا ہے''

اب جو میں نے دیکھا تو وہ شخص اسی نوجوان لڑکے کی طرف اشارہ کر رہا تھا جو ابھی کچھ لمحے پہلے ایک کوڑھی تھا، یہ دبلا پتلا سا کھڑے ناک نقشے والا لڑکا علی حسن تھا، زرینہ کا نام سن کر میں چونک پڑا پھر اس شخص نے اسے اپنا بیٹا کہا تھا تو یہ علی حسن کے والد شتاب علی تھے اور یہ عورت اس کی والدہ زرینہ جس کے متعلق میں خود لی حسن کی زبانی سب کچھ سن چکا تھا۔

علی حسن یعنی سابقہ مردھر کی آنکھیں اس وقت دعا مانگتے ہوئے بند تھیں ب جو اس نے آنکھیں کھول کر اپنے برابر ہی اپنی والدہ زرینہ اور اپنے والد شتاب لی کو دیکھا اور پھر ایک نظر اپنے صحت مند جسم پر ڈالی تو وہ سجدے میں گر گیا۔

بارگاہ ایزدی میں یہ اس کا آخری سجدہ تھا سجدہ شکر جس سے اس کا سر نہ ھ سکا شتاب علی نے کافی دیر انتظار کرنے کے بعد اسے اٹھانا چاہا اور جب ان کے نے پر اس کا جسم ایک طرف لڑھک گیا تو ان کے منہ سے چیخ نکل گئی علی حسن اب شہ کے لئے مر چکا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی ماں بھی اس سے لپیٹ کر رونے لگی اور نوں بمشکل اس کی لاش سے علیحدہ کئے جا سکے علی حسن کو پیر صاحب چونڈیرے یف ہی کے مزار کے برابر دفن کر دیا گیا۔

میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اس کے حالات اس کے ماں باپ کو بتا انہیں دکھ پہنچاؤں، شمیم نوید! تم اگر آج بھی چونڈیرے جاؤ تو مزار شریف کے ہی جو قبر بنی ہوئی ہے اس کے کتبے پر علی حسن کا نام پڑھ سکتے ہو علی حسن جس نکڑوں جسم تبدیل کئے علی حسن جسے موت نہیں تھی علی حسن جو پراسرار قوتوں کا تھا علی حسن جو اب ہمیشہ کیلئے مر چکا ہے۔

اب جو میں نے دیکھا تو وہ شخص اسی نوجوان لڑکے کی طرف اشارہ کر رہا تھا جو ابھی کچھ لمحے پہلے ایک کوڑھی تھا' یہ دبلا پتلا سا کھڑے ناک نقشے والا لڑکا علی حسن تھا' زرینہ کا نام سن کر میں چونک پڑا پھر اس شخص نے اسے اپنا بیٹا کہا تھا تو یہ علی حسن کے والد شتاب علی تھے اور یہ عورت اس کی والدہ زرینہ جس کے متعلق میں خود علی حسن کی زبانی سب کچھ سن چکا تھا۔

علی حسن یعنی سابقہ مردھر کی آنکھیں اس وقت دعا مانگتے ہوئے بند تھیں اب جو اس نے آنکھیں کھول کر اپنے برابر ہی اپنی والدہ زرینہ اور اپنے والد شتاب علی کو دیکھا اور پھر ایک نظر اپنے صحت مند جسم پر ڈالی تو وہ سجدے میں گر گیا۔ بارگاہ ایزدی میں یہ اس کا آخری سجدہ تھا سجدہ شکر جس سے اس کا سر نہ اٹھ سکا شتاب علی نے کافی دیر انتظار کرنے کے بعد اسے اٹھانا چاہا اور جب ان کے ہلانے پر اس کا جسم ایک طرف لڑھک گیا تو ان کے منہ سے چیخ نکل گئی علی حسن اب ہمیشہ کے لئے مر چکا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی ماں بھی اس سے لپیٹ کر رونے لگی اور دونوں بمشکل اس کی لاش سے علیحدہ کئے جا سکے علی حسن کو پیر صاحب چونڈریے شریف ہی کے مزار کے برابر دفن کر دیا گیا۔ میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اس کے حالات اس کے ماں باپ کو بتا کر انہیں دکھ پہنچاؤں' شمیم نوید! تم اگر آج بھی چونڈریے جاؤ مزار شریف کے قریب ہی جو قبر بنی ہوئی ہے اس کے کتبے پر علی حسن کا نام پڑھ لو علی حسن جس نے سینکڑوں جسم تبدیل کئے علی حسن جسے موت نہیں تھی علی حسن پر اسرار قوتوں کا مالک تھا علی حسن جو اب ہمیشہ کیلئے مر چکا ہے۔

ختم شد